فروری
۲۰۰۳

موسس: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد ۱۳۰، عدد ۲، ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ، فروری ۲۰۰۳ء

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر

مسلم سجاد

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۵۷۰

فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)

فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@wol.net.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - ۵۴۶۰۰

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زر سالانہ: ۲۰۰ روپے

تاحیات: ۳۰۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران، بھارت: ۶۰۰ روپے

یورپ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، افریقہ: ۹۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا: ۱۲۰۰ روپے

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

۶۰ سال پہلے

حساب آمد و خرچ جماعت اسلامی

(از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۴۲ء)

تفصیل آمد

بقایا با ختتام اگست ۴۱ء	۷۴-۱۴-۰
فروخت کتب	۷۴۱۳-۱۵-۹
اعانت اہلِ خیر	۵۹۴۳-۱۳-۹
زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ	۶۱۶-۱۰-۳
قرض	۲۱۴۱-۰-۰
وصولی قرض	۱۵۰-۲-۶
متفرق	۶۶۴-۱۳-۳
میزان آمد	۱۷۰۰۵-۵-۶
میزان خرچ	۱۳۹۶۳-۱۱-۰
بقایا[1] اختتام دسمبر ۴۲ء	۳۰۴۱-۱۰-۶

تفصیل خرچ

طباعت کتب[2]	۵۳۶۵-۱۵-۳
خرچ ڈاک	۵۸۹-۱۰-۶
کتب ایجنسی	۱۱۹۵-۰-۰
معاوضہ کارکنان	۶۷۴-۰-۰
اشتہار	۲۵-۸-۰
اسٹیشنری	۹۸-۴-۶
سفرخرچ	۲۸۶-۲-۰
مہمانِ خانہ	۴۶۵-۱۳-۶
اعانت اہلِ حاجت	۱۵۰-۴-۰
پریس[3]	۳۱۳۷-۱-۳
قرض جو بعض ارکانِ ادارہ کو دیا گیا	۲۵۹-۲-۶
ادائے قرض[4]	۱۴۴۳-۰-۰
عربی تراجم[5]	۲۰-۰-۰
متفرق	۲۵۳-۱۳-۶
میزان	۱۳۹۶۳-۱۱-۰

---

[1] اس کے علاوہ جماعت کے بک ڈپو میں ختم سال پر تقریباً چھ ہزار روپیہ کی کتابیں موجود تھیں اور مختلف تاجرانِ کتب اور بیرونی جماعتوں اور اشخاص کے ذمہ بک ڈپو کے ۲۲۷۱ روپیہ ایک آنہ چھ پائی واجب الادا تھے۔ [2] ختم سال پر حسابات کی جانچ سے ۵۷ روپیہ ۲؍ کاغذ کے حساب میں زائد نکلے اور انھیں متفرق آمدنی میں شامل کر دیا گیا۔ اس طرح طباعتِ کتب کے واقعی مصارف ۵۳۰۸-۱۳-۳ ہیں۔ [3] پریس کی خریداری اور حمل ونقل اور ضروریات کی فراہمی کے سلسلہ میں جو رقمیں علی الحساب دی گئی تھیں ان میں سے ۴۵۰ روپے بعد میں واپس ہو گئے اور متفرق آمدنی میں شامل کر دیے گئے۔ اس طرح پریس کے حقیقی مصارف ۲۶۸۷-۱-۳ ہیں۔ [4] نقد ادائیگی کے علاوہ ایک صاحب کے قرض میں ۱۲ روپے بصورتِ کتب بھی ادا کیے گئے ہیں۔ اس طرح جماعت کے ذمہ واقعی قرض ۶۸۶ روپے ہیں۔ [5] سال کے اواخر میں مولانا ابوالحسن علی صاحب کے زیرنگرانی جماعت کے لٹریچر کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ ترجمے سب بلا معاوضہ کیے جا رہے ہیں۔ یہ رقم صرف تبلیغ اور ممالکِ عربیہ کے اخبارات ورسائل سے مراسلت پر صرف ہوئی ہے۔ (ترجمان القرآن ' جلد ۲۲ ' عدد ۱-۲ ' محرم وصفر ۱۳۶۲ھ ' فروری ۱۹۴۳ء ' ص ۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

امریکی عزائم : مقابلے کی حکمت عملی

پروفیسر خورشید احمد

امریکہ عالم اسلامی کے خلاف جن پالیسیوں پر عمل پیرا ہے‘ ان سے اس کے مذموم عزائم دیکھنے والوں کی نظر میں کھلی کتاب کی طرح سامنے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہماری جوابی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟ قرآن پاک کے مطالعے اور سیرتؐ پاک پر تدبر کرنے سے جو حکمت عملی ہمارے سامنے آتی ہے اسے دو نکات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے: ۱- استقامت‘ ۲- حکمت۔

استقامت

استقامت یہ ہے کہ اللہ پر پورا بھروسا کیا جائے اور اللہ کا دین‘ جیسا کہ وہ ہے‘ اس پر پورے اطمینان‘ یقین محکم اور صبروثبات کے ساتھ ڈٹ جایا جائے۔ اپنے مقصد اور نصب العین‘ مستقبل کے بارے میں اپنے وژن اور اُمت مسلمہ کے حقیقی اہداف‘ اس کی قوت کے اصلی ذرائع‘ اور اقامت دین کے سلسلے میں اس کے اصول‘ مشن اور مخصوص عملی پروگرام پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ اسلام کی تراش خراش ہمارا طریقہ نہیں ہوسکتا اور اسلام کے دائرے کے اندر فکروتدبر‘ اطاعت اور اجتہاد‘ وفاداری اور رواداری‘ جدوجہد اور ایثار کے لیے جو خطوطِ کار‘ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دیے ہیں‘ ان پر ایمان اور احتساب کے ساتھ جم جایا

جائے۔ اسلام اللہ کی ابدی ہدایت ہے۔ اس کی تعلیمات صبح نو کی طرح تازہ، نکھری ہوئی اور جدید ہیں۔ اعتدال اور توازن اس کا طرۂ امتیاز ہے، لیکن یہ اس کے اپنے نظام کے اندر اور اس کا ابدی حصہ ہیں، اپنے نفس یا دوسروں کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اسے موڈرن یا موڈریٹ نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ حقیقت اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام ہی راہِ اعتدال ہے اور سارا توازن، رواداری، میانہ روی، اس کے دیے ہوئے حقوق و فرائض کے نظام میں اپنی کامل شکل میں موجود ہیں۔ اُمت مسلمہ ہے ہی امت وسط اور عقیدہ و عمل ہر اعتبار سے یہ اُمت مسلک اعتدال پر قائم ہے۔ مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے اور آپ پائیں گے کہ خدا اور انسان، معبود اور عبداللہ اور پیغمبر کے رشتے اور حقوق و مقام کے باب میں کس طرح وہ افراط اور تفریط کا شکار رہے ہیں۔ اسلام نے نقطۂ عدل کو واضح کر دیا۔ خدا خدا ہے اور انسان انسان۔ لائق عبادت و عبودیت صرف اللہ ہے جو خالق سماوات والارض ہے۔ انسان کا مقام اللہ کے خلیفہ اور نائب کا ہے۔ وہ کسی حیثیت سے بھی خدا کی ذات یا صفات میں شریک نہیں۔ حتیٰ کہ خدا کے پیغمبر بھی، بہترین نمونہ اور قرب الٰہی میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود خدا کے اقتدار میں کسی قسم کی اور کسی بھی قدر شرکت نہیں رکھتے۔ یہی وہ اعتدال ہے جس پر کائنات قائم ہے۔

پھر آپ مذاہب کی تاریخ میں دین اور دنیا، روح اور مادہ، اس زندگی اور اُس زندگی کے باب میں افراط و تفریط کا سماں دیکھیں گے۔ لیکن اسلام نے یہاں بھی وہی راہِ اعتدال اختیار کی اور دین و دینا کی یک رنگی، روح اور مادے کی ہم آہنگی، اور حسنات دنیا اور حسنات آخرت کے اجتماع کی شکل میں ایک متوازن اور مبنی بر عدل تصورِ حیات کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اس پر عملاً فرد اور اجتماع، ذاتی سیرت اور اجتماعی تہذیب کا نقشہ تعمیر کر کے دکھا دیا۔

اسی طرح قانون اور اخلاق، ظاہر اور باطن، لفظ اور معنی کے باب میں افراط و تفریط کے بے شمار نمونے، مذہب اور تہذیب دونوں کی دنیاؤں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن اسلام نے پھر ایک راہِ اعتدل اختیار کی اور اس طرح اختیار کی کہ ثبات اور تغیر کے تمام تقاضے بھی بھرپور انداز میں پورے ہوئے اور قانون اور روحِ قانون دونوں کو بیک وقت حاصل کرنا انسان کے لیے

ممکن ہوگیا۔

معاملہ فرد اور معاشرے کے تعلقات کا ہو یا مرد و زن کے رشتے کا‘ آزدی اور نظم و ضبط کا ہو یا قیادت اور مشاورت کا‘ عبادت کا ہو یا کاروبارِ زندگی کا‘ باطن کی اصلاح ہو یا قانون اور نظام کی تبدیلی‘ دوستی کی بات ہو یا دشمنی کے آداب‘ ہر معاملے میں اسلام نے اعتدال کے راستے کو اختیار کیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملے میں اسلام کی اس شناخت کو بیان فرما دیا کہ بہترین عمل وہی ہے جو راہِ وسط پر قائم ہو: خیر الامور اوسطھا ۔ دیکھیے قرآن وسنت نے کس طرح اسلام کے اس وصف کو نمایاں کیا ہے اور زندگی کا محور بنا دیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ .... عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرہ ۲:۱۴۳)

ہم نے تمھیں ایک اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم انسانوں پر حق کے گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ .... وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○ (الاعراف ۷:۱۸۱)

اور ہماری مخلوق میں ایک اُمت ہے جو ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق کے مطابق انصاف کرتی ہے۔

اللہ کے بندوں کا وصف ہی یہ ہے کہ وہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا .... بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ (الفرقان ۲۵:۶۷)

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

وہ کھاتے پیتے ہیں مگر اسراف سے بچتے ہیں کہ اللہ کو اسراف پسند نہیں (وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ج اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○ الاعراف ۷:۳۱)۔ انفاق فی سبیل اللہ ان کا وطیرہ ہے مگر اس میں بھی نہ وہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھتے ہیں اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑتے ہیں (وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا – بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)۔ نوافل کا وہ اہتمام کرتے ہیں لیکن اس میں بھی اعتدال اور استمرار ان کا شعار ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں

اور افطار بھی کرتا ہوں‘ قیام اللیل بھی کرتا ہوں اور آرام بھی‘ اور ازدواجی زندگی کا بھی اہتمام کرتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ اسلام ہی وہ دین اور نظامِ حیات ہے جو عبارت ہے زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال‘ توازن‘ عدل‘ انصاف‘ ادایگی حقوق‘ فرائض کی پابندی‘ صلہ رحمی‘ احترامِ انسانیت‘ مخالف کے معبودوں کو بھی بدزبانی سے محفوظ رکھنے اور دین میں ہر جبر اور اکراہ سے پرہیز سے۔ یہ ہے اسلام اور اسلام کی امتیازی شان!

یاد رکھیے یہ ساری میانہ روی‘ اعتدال اور رواداری شریعت کے نظام کا حصہ ہے‘ اور منصوص اور مطلوب ہے--- لیکن میانہ روی کے نام پر اسلام میں قطع و برید‘ اعتدال کے نام پر فرائض اور واجبات سے رخصت‘ دوستی کی خاطر جہاد سے فارغ خطی‘ رواداری کے نام پر کفر اور ظلم سے سمجھوتہ--- یہ اسلام نہیں‘ اسلام کی ضد اور اس سے فرار کی راہ ہیں۔ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکام اور حدود کے بارے میں کوئی مداہنت اللہ کی ناراضی کو مول لینے کا راستہ ہے اور اس کے عذاب کو دعوت دینے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے محمود اور مطلوب قرار دیا ہے وہی ہمارا محمود اور مطلوب ہے اور جسے انھوں نے ناپسند کیا ہے اس سے برأت ہی ہماری میانہ روی اور رواداری ہے۔ اس لیے کہ اسلام نام ہی طاغوت سے بغاوت اور اللہ سے رشتے کو جوڑنے کا ہے--- فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ق لَاانْفِصَامَ لَھَا ط وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ o (اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ البقرہ ۲:۲۵۶)۔ اسلام کے نظام اور فریم ورک میں بے پناہ آزادی ہے مگر یہ آزادی اس فریم ورک کے اندر ہے‘ اس فریم ورک کو توڑنے‘ اس سے فرار اختیار کر کے یا اس کے باہر آزادی کی تلاش اسلام کے منافی ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے اقبال نے یوں کہا ہے کہ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

دین کو ہر پیوندکاری سے محفوظ رکھنا اور دوسروں کے مطالبوں پر یا انھیں خوش کرنے کے

لیے دین میں قطع و برید اللہ کی اطاعت کا نہیں اس سے بغاوت کا راستہ ہے۔ دیکھیے خود اللہ اپنے رسولؐ کو خطاب کر کے کیا کہتا ہے:

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ .... لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (المومن ۴۰:۶۶)

اے نبیؐ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے ان ہستیوں کی عبادت و اطاعت سے منع کر دیا گیا ہے جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔ میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں، جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے کھلی کھلی نشانیاں آ چکی ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ رب العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ .... مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ○ (الانعام ۶:۵۶)

اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو، ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے اور کہو میں تمھاری خواہشات ذات کی پیروی نہیں کروں گا اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا اور راہِ راست پانے والوں میں سے نہیں رہا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ .... مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ○ (الرعد ۱۳:۳۷)

اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ قرآن عربی تم پر نازل کیا ہے، اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمھارے پاس آ چکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمھارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا .... لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۳)

اے نبیؐ! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمھیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمھاری طرف بھیجی ہے تا کہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمھیں اپنا دوست بنا لیتے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ .... يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (یونس ۱۰:۱۵)

جب انھیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم

کرو۔ اے نبیؐ، ان سے کہو تیرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر وتبدل کروں۔ میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

یہ آیات بینات ایک آئینہ ہیں جن میں اہل حق کے موقف اور مثال اور اہل باطل کی خواہشات، ترغیبات اور مطالبات ہر دو کی مکمل تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ زمانہ کتنا ہی بدل جائے اور تاریخ کے اسٹیج پر کارفرما کردار کیسے ہی نئے ناموں اور نئی شکلوں میں نمودار ہو جائیں، اہل حق اور اہل باطل کا مسلک اور رویہ سرمو نہیں بدلتا۔ اس آئینے میں غیروں ہی کی نہیں بہت سے دوستوں کی اصل صورت بھی دیکھی جا سکتی ہے اور اس میں ہمیں وہ اسوہ بھی صاف نظر آتا ہے جو استقامت اور وفاداری کی راہ ہے۔ یہی ہمارا مطلوب ومقصود ہونا چاہیے۔

وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰی .... وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلاً ○ (الاحزاب ۳۳:۲-۳)

پیروی کرو اس بات کی جس کی طرف رہنمائی تمھارے رب کی طرف سے تمھیں کی جا رہی ہے اور اللہ اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ اللہ پر توکل کرو، اللہ ہی تمھارا وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ .... لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ○ (الجاثیہ ۴۵:۱۸-۲۰)

اے نبیؐ! ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمھارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں۔

استقامت ہماری حکمت عملی کی پہلی بنیاد ہے، اور اس کا تقاضا ہے کہ مقصد، مشن، اہداف اور منزل کے بارے میں نہ کوئی ابہام اور جھول رہے اور نہ کوئی کمزوری دکھائی جائے۔ وژن بہرصورت واضح اور ہر دھند سے پاک ہونا چاہیے۔ اس پر جم جانا، اللہ کا دامن تھامے رکھنا،

صرف اس کی قوت پر بھروسہ کرنا اور صبر اور پامردی کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹ جانا اہل ایمان کا شیوہ اور طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں ان کی بقا اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راز ہے۔

حکمت

اگر استقامت اس حکمت عملی کی پہلی بنیاد ہے تو اس کی دوسری بنیاد اور اتنی ہی اہم بنیاد حکمت اور دانش مندی ہے۔ استقامت کسی اندھی اور بہری قوت کا نام نہیں' استقامت کے لیے ضروری ہے کہ ساری جدوجہد پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ انجام دی جائے جس میں کلیدی کردار مقاصد کے صحیح شعور' تدابیر کی مکمل تفہیم' نقشہ کار کی دقّت نظر سے تیاری' وسائل اور لوازمات کے حصول کی موثر منصوبہ بندی اور تدبیر منزل کی تمام ضروریات کا پورا پورا ادراک اور ان کو عملاً حاصل کرنے اور صحیح وقت پر صحیح انداز میں استعمال کرنے کا اہتمام ہوگا۔ قرآن پاک کے مطالعے اور سیرت خیرالانامؐ پر تدبر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکمت' کار نبوت کی انجام آوری کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور بیک وقت استقامت اور حکمت پر مبنی راستہ ہی وہ راستہ ہے جس سے اہل دین اپنی منزل کو پا سکتے ہیں۔ ان کی حیثیت انسان کی دو ٹانگوں کی طرح ہے۔ پیش قدمی کے لیے دونوں ٹانگیں درکار ہیں' محض ایک کے سہارے منزل سر نہیں کی جا سکتی۔

میانہ روی اور رواداری: حکمت کا تقاضا ہے کہ جہاں ہم دین میں کوئی قطع و برید نہ کریں اور نہ ہونے دیں بلکہ اللہ کے دین کو جیسا کہ وہ ہے مضبوطی سے تھام لیں وہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم کسی اشتعال میں نہ آئیں' اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں' اسلام کی سکھائی ہوئی میانہ روی اور رواداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں' اپنی داعیانہ حیثیت کو نہ بھولیں۔ ہماری لڑائی مرض سے ہے مریض سے نہیں' کفر سے ہے' وہ بھی اہل کفر کو ایمان کی دولت سے مالا مال کرنے کے لیے ہے' نیست و نابود کرنے کے لیے نہیں۔ اللہ کی ساری مخلوق کے کچھ حقوق ہیں اور ان کو دین حق کی طرف لانے کے کچھ آداب ہیں۔ ان کا احترام اور اہتمام ہی حکمت دین ہے۔ مالک کا حکم ہے:

اُدْعُ اِلٰی .... بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (النحل ۱۶:۱۲۵)

اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ .... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران ۳:۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا ....كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ○ (حٰم السجدہ ۴۱:۳۳-۳۴)

اور اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبیؐ! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے رفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

عدل کی روش: حکمت ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہم عدل و انصاف کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیں حتیٰ کہ مخالفت' جنگ و جدال اور مذاکرہ و مجادلہ' ہر میدان میں ہم عدل کی راہ پر قائم رہیں اور فراستِ مومن کے ساتھ نرمی اور سختی' عفو و درگزر اور مقابلہ اور انتقام' ہاتھ روکنے اور دشمن پر وار کرنے کے تمام ممکنہ ذرائع اپنے اپنے صحیح وقت پر استعمال کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عدل اور قسط کے ساتھ احسان' بدلہ اور انتقام کے ساتھ عفو و درگزر' جنگ کے ساتھ صلح' اور قوت کے استعمال کے ساتھ مذاکرے اور معاہدے کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقع اور محل پر ضروری ہے۔ حکمت اور فراست اس کا نام ہے کہ ان میں سے ہر حربے کو اس کے صحیح وقت پر استعمال کیا جائے اور یہاں بھی اعتدال اور توازن پر کاربند رہا جائے۔ دیکھیے اس باب میں قرآن کس طرح ہماری رہنمائی اور تربیت کرتا ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (الاعراف ۷:۲۹)

تم کہہ دو' میرے رب نے عدل اور قسط کا حکم دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ .... لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۹۰)

اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق سیکھ لو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا .... بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ .... اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۹۴)

لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے' تم بھی اُسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے' جو اس کی حدُود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا .... خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ○ (النحل ۱۶:۱۲۶)

اگر تم لوگ بدلہ لو تو اُسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ .... ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (الشوریٰ ۴۲:۴۰-۴۳)

برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کر دے اُس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے' اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں اُن کو ملامت نہیں کی جاسکتی' ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے' تو یہ بڑی اُولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے' جو اپنے دین کی حفاظت میں

مارا جائے وہ شہید ہے' جو اپنے نفس کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے (ترمذی)۔

اس طرح اللہ نے مسلمانوں کو ہر لحہ تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور صرف تیار رہنے ہی کا نہیں مقابلے کی قوت (deterrant power) کے حصول کو لازم کیا ہے۔ اور اس کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کی ترغیب دی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ .... وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (انفال ۸:۶۰)

اور تم لوگ' جہاں تک تمھارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور اُن دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے --- اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمھارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

وَاِنْ .... اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ○ (انفال ۸:۶۱-۶۲)

اے نبیؐ، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہیں تو تمھارے لیے اللہ کافی ہے وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔

مقابلے اور معاملات میں غصہ اور اشتعال سے پرہیز کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ ○ الشوریٰ ۴۲:۳۷) اس لیے کہ مومن غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہوتے ہیں (وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط آل عمران ۳:۱۳۴) علامہ قرطبی' امام رازی اور علامہ ابن عربی مالکی نے بہت خوب کہا ہے کہ عفو و درگزر کے نتیجے میں اگر فتنہ دب رہا ہے اور غلط کار اپنی روش سے باز آ رہا ہے تو عفو پسندیدہ ہے لیکن اگر عفو و درگزر سے مجرم کا حوصلہ بڑھ جائے اور اس کے غیض و غضب کو تقویت پہنچے تو انتقام لینا صحیح ہے۔ ان مواقع میں تمیز اور

حسب حال رویہ کے اختیار کرنے کا نام ہی حکمت ہے۔

مکالمے کی ضرورت: حکمت ہی کا ایک پہلو مکالمہ' گفت وشنید اور ڈائیلاگ ہے اور وہ بھی صحت کلام کے ساتھ ساتھ شیریں کلامی کے ذریعہ (وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا - البقرہ ۲:۸۳) اس لیے کہ اللہ کی تعلیم ہے ہی یہ کہ وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط ''میرے بندوں (مسلمانوں) سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہترین ہو (بنی اسرائیل ۱۷:۵۳)۔ اور ڈائیلاگ کے بھی آداب یہ ہیں کہ قدر مشترک کی طرف بلایا جائے (تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ---- آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ آل عمران ۳:۶۴) نیز یہ کہ:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ .... بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (النحل ۱۶:۱۲۵)
اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ .... بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (حم السجدہ ۴۱:۳۴)
نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔

یہ سب حکمت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔

اسی طرح یہ بات کہ کب قوت کا استعمال مطلوب ہے اور کب ہاتھ روک لینا اولیٰ ہے اور اس کا استعمال بھی حکمت ہی سے ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی ایک وحدت ہیں لیکن کون سا طریقہ کب استعمال کیا جائے اس کا انحصار حکمت بالغہ پر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ .... فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَہ ○ (النساء ۴:۷۷-۷۸)
تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو اُنھیں لڑائی کا حکم دیا گیا ہے تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ اِن سے کہو' دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس

انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمّہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت' تو جہاں بھی تم ہو' وہ بہرحال تمھیں آ کر رہے گی' خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ حکمت کے پہلو اتنے ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ ہم صرف چند اشارات پر قناعت کر رہے ہیں اور جو کچھ عرض کیا ہے بطور مثال ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ استقامت اور حکمت دونوں کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے' کسی ایک کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور دونوں کے دامن میں جو وسعت اور تنوع ہے ان کا احاطہ بھی ضروری ہے۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ استقامت اور حکمت ہی وہ راستہ ہے جس پر بیک وقت چل کر ہم آج بھی اسلام کے خلاف کی جانے والی ساری سازشوں' منصوبوں اور تحریکوں کا کامیابی سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ جس طرح سمجھوتا اور دشمن کے آگے سپر ڈال دینا موت کا راستہ ہے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہوکر' مناسب تیاری کے بغیر' اشتعال اور تشدد کا راستہ بھی حق و ثواب کا راستہ نہیں۔ ''موڈریٹ اسلام'' کے نام پر اسلام سے برگشتہ کرنے' باطل قوتوں سے سمجھوتہ کرنے یا راہِ حق سے فرار کی راہ اختیار کرنے میں دنیا اور دین دونوں کا خسارہ ہے لیکن اس یلغار کا مقابلہ بھی اسلام ہی کی بتائی ہوئی راہِ اعتدال و حق و انصاف پر جم جانے ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کو اختیار کر کے ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریک اسلامی کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور اسی راستے پر چل کر آج بھی ہم اللہ کی رضا اور دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

اس وقت اُمت کے ارباب دانش' اسلامی تحریکات کے قائدین اور مسلمان ملکوں کی قیادت کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان قرآنی بنیادوں پر وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا حکمت عملی بنائی جائے؟ اس حکمت عملی کی روشنی میں کیا پالیسیاں اور کیا اقدامات تجویز کیے جائیں تاکہ اُمت اپنا صحیح مقام حاصل کرسکے اور دنیا کو بھی نئے استعمار کی

جارحیت سے محفوظ رکھا جا سکے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے خود اپنے گھر کی اصلاح کا نقشہ بنایا جائے۔ ان خطوط کار کا تعین بھی ضروری ہے جن پر دنیا کی دوسری اقوام‘ خصوصیت سے امریکہ سے آیندہ معاملات کیے جائیں۔ اس کے تین محاذ ہوں گے: ہر ملک کا اپنا محاذ‘ اُمت مسلمہ کا اجتماعی محاذ اور عالمی سطح پر نئے نظام اور اس کے قیام کے لیے منصوبہ بندی۔ بلاشبہہ امریکہ اور اس کے عزائم اس پورے معاملے میں ایک کلیدی مقام رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں ایک سوچے سمجھے موقف کی ضرورت ہے۔ ہم مسلمانوں کے تمام اہل فکر اور خصوصیت سے اسلامی تحریکات اور مسلمان حکومتوں کے کارپردازوں کو دعوت دیتے ہیں کہ ان امور پر غوروفکر اور مباحثے اور مذاکرے کا اہتمام کریں۔ اس سلسلے میں ہم اپنی گزارشات اُمت کے سوچنے سمجھنے والے عناصر‘ مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار حضرات اور ان لوگوں کی خدمت میں عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں جو اسلامی تحریکات اور مسلم ممالک کی قیادت پر فائز ہیں۔

تین راستے

ہماری اب تک کی گزارشات سے یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ اُمت کے لیے غفلت اور فرار کا راستہ مکمل تباہی کا راستہ ہوگا۔ اس لیے مقابلہ اور مردانہ وار مقابلہ ہی زندگی اور بقا کا راستہ ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ حالات کے آگے سپر ڈالنے کے معنی محکومی اور موت کے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے نتیجے میں ہم سوا ارب کی اُمت ہوتے ہوئے بھی خس و خاشاک سے زیادہ وزن کے حامل نہ ہوں گے اور بالآخر ایک نئی سیاسی‘ معاشی اور تہذیبی غلامی کی گرفت سے بچ نہ سکیں گے۔ یہ راستہ جس قوم نے بھی اختیار کیا‘ وہ تاریخ کے اوراق میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئی‘ عبرت کا نشان بن گئی اور کبھی باقی نہیں رہی۔ افسوس کہ مسلمانوں کی ایک قابل ذکر تعداد نے طوعاً یا کرہاً‘ لیکن عملاً اس تباہ کن راستے کو اختیار کر لیا ہے۔ کچھ شیطانی قوتوں کے باقاعدہ شریک کار بن گئے ہیں اور کچھ خاموش تماشائی یا نوالہ تر بننے پر آمادہ نظر آ رہے ہیں۔ یہ دراصل ذہنی‘ فکری اور عملی طور پر ہتھیار ڈال دینا ہے۔ دشمن کے رنگ میں رنگ جانا ہے‘

جسم کو بچانے کی موہوم امیدوں کے نام پر' ایمان' تہذیب' اقدار' نظریات اور تصورِ حیات تک کی قربانی دے دینا ہے۔ ترکی میں کمال ازم نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ مغرب اور مغرب کے کاسہ لیس دانش ور' مسلمانوں کو آج بھی سیکولرازم اور قوم پرستی کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر یہاں یہ جان لینا چاہیے کہ یہ راستہ نہ صرف روحانی اور اخلاقی موت بلکہ تہذیبی موت کا ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ شریک کار نہ بنا جائے' نرم چارہ نہ بنا جائے اور بس اپنے آپ کو بچالیا جائے۔ اسے تحفظ کی حکمت عملی کہتے ہیں۔ اس حکمت عملی پر ایک طبقے نے مغربی اقوام کی استعماری یلغار کے پہلے دور میں بھی عمل کر کے دیکھ لیا لیکن افسوس اس سے ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ یہ حکمت عملی ہتھیار ڈال دینے (سرنڈر) کی پالیسی سے کچھ بہتر ہے۔ اس میں اپنے آپ کو مسجد' مدرسہ اور خانقاہ میں محصور کر کے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ حکمت عملی بھی ناکافی' نامکمل اور نادرست ہے' صلاحیت میں خطرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پر جمود طاری ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر مغلوبیت اور محکومیت ایسی اقوام کا مقدر بن جاتے ہیں۔

تیسرا راستہ تصادم اور انتقام کا راستہ ہے کہ جذبات میں آکر میدان میں کود پڑو' بس جان کی بازی لگا دو' اڑا دو اور تباہ کر دو اور جس چیز پر حملہ آور ہو سکتے ہو' حملہ کر ڈالو۔ یہ بھی کوئی دانش مندی کا راستہ نہیں اور نہ اسے کسی پہلو سے آئیڈیل شکل کہا جا سکتا ہے۔ جذبات کی ایک اہمیت ہے' لیکن جذبات کے ساتھ ساتھ تفکر اور سوچ بچار کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق کار کی تعلیم دی ہے وہ استقامت کے ساتھ حکمت سے عبارت ہے۔ اس میں قوت کا استعمال تو ایک ضروری عنصر ہے مگر قوت کا بے محابا استعمال یا بس اندھی انتقامی کارروائی کا کوئی مقام نہیں۔ اس میں قوت کو حکمت کے ساتھ استعمال کرنا شامل ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر تیاری اور صحیح حکمت عملی اور صحیح وقت کا تعین کیے بغیر جنگ کرنا' حماقت اور خودکشی ہے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳ سال تک مکہ میں اپنی دعوت اور اپنے مسلک کے اُوپر قائم رہتے ہوئے ظلم کو برداشت کیا' دعوت کے لیے نئے سے نئے راستے نکالے لیکن عسکری مزاحمت نہیں کی۔ مدینہ آنے کے بعد بھی یک لخت فوج کشی شروع نہیں کر دی' بلکہ دفاعی تیاریاں کیں' اپنی قوت کار کو منظم و مرتب کیا' دشمن کے خلاف اقدام میں

پہل نہ کی اور اپنی اجتماعیت کو میثاقِ مدینہ کی شکل میں مستحکم کیا۔ یہودی جو بغل میں بیٹھے ہوئے تھے اُن سے معاملات طے کیے' اور جب جنگ مسلط کر دی گئی تو اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بلاشبہہ رب کی مدد اور نصرت پر بھروسا کیا لیکن اس یقینی بھروسے کے ساتھ ساتھ مادی سطح پر تیاری بھی کی۔ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا: اللہ پر توکل کرو' مگر اونٹ باندھ کر رکھو۔ اگر اُونٹ کو آپ باندھیں گے نہیں' تدبیر اور حکمت اختیار نہیں کریں گے تو صرف توکل کی بنیاد پر کوئی ردعمل اسلامی ردعمل نہیں کہلائے گا--- گویا کہ محض جذباتی ہوکر' وقتی طور پر کچھ کر دینا' یہ بھی ایک راستہ ہے' مگر اس راستے میں خیر کے امکانات بہت ہی کم ہیں' البتہ تباہی اور برس ہا برس کی محنتوں پر پانی پھر جانے کا خطرہ ضرور ہے۔

اصل اور حقیقی اهداف

میں جتنا بھی غور کرتا ہوں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں مسلم اُمت کم و بیش اسی نوعیت کے چیلنجوں سے دوچار ہے جو بیسویں صدی کے آغاز پر ہمیں درپیش تھے۔ بلاشبہہ گذشتہ ۵۰ سال میں ہم نے بہت کچھ پیش رفت کی ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی ہے کہ سیاسی آزادی کے حصول اور معاشی وسائل کی فراہمی کے باوجود ہم ایک بار پھر ویسی ہی استعماری یلغار کی زد میں ہیں جس سے بیسویں صدی کے پہلے ربع میں ہمیں نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس کربناک ماحول میں اللہ کے چند بندوں نے اُمت کی بیداری اور تنظیمِ نو کا بیڑا اٹھایا اور حالات سے سمجھوتا کرنے کے بجاے استقامت اور حکمت کے ساتھ مقابلے کا راستہ اختیار کیا۔ جمال الدین افغانی' محمد عبدہٗ' علامہ محمد اقبال' امیر شکیب ارسلان' سعید نورسی' حسن البنا شہید اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے اپنے عصری حالات و ماحول کی روشنی میں ایک حیات بخش لائحہ عمل تیار کیا اور اُمت کو اس جادہ پر گامزن کیا۔ آج بھی ان سارے تجربات کو سامنے رکھ کر مقابلے اور تعمیرنو کی حکمت عملی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اصل اہداف کا تعین کرلیا جائے اور پھر ان اہداف کے حصول کے لیے دیکھا جائے کہ کن خطوط پر حکمت عملی وضع کی جائے۔ صرف تذکیر کی خاطر عرض ہے کہ اس سلسلے میں تین امور

مرکزی اہمیت کے حامل ہیں، یعنی:

۱- **اصل ھدف کا تعین:** ہماری نگاہ میں اصل ہدف یہ ہے کہ ہمیں اپنے ایمان، اپنے نظریے، اپنے نصب العین سے سرموانحراف نہیں کرنا چاہیے۔ جس چیز کا تقاضا ہمارا ایمان کرتا ہے، وہ اسلام کے بارے میں ہمارا وژن ہے۔ اسلام کے مکمل نظامِ زندگی ہونے پر پختہ ایمان ہو۔ اس میں نبی پاکؐ کی سنت مطہرہ ہمارا طریقہ اور سہارا ہے۔ ہمیں اِس ہدایت کے ماخذ سے روشنی حاصل کر کے نقشۂ زندگی مرتب کرنا ہے۔ اس میں سب سے اہم چیز اپنی شناخت کا تحفظ ہے۔ اگر ہماری شناخت مجروح یا تحلیل ہو جائے تو پھر ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ مادی ترقی اور قوت جیسا کہ ہم عرض کریں گے ضروری ہے، مگر پہلی چیز اسلامی شناخت اور حنفیت ہے۔ گویا اس حکمت عملی میں ہمارا پہلا ہدف اپنے وژن، اپنے ایمان، اپنی شناخت اور اپنی منزل کا تحفظ ہے۔ اس پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔

۲- **قوت کا حصول:** قوت کے ذریعے ہم اپنے اِس وژن کو صحیح طور سے حاصل کر سکیں گے۔ یہ محض آنکھیں بند کر کے آگ میں کود جانے والی بات نہیں ہے، بلکہ اخلاقی اور اجتماعی قوت، مادی اور عسکری قوت کا حصول بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک منصوص ضرورت ہے۔ قرآن نے اپنے اندر مقابلے کی جو استطاعت پیدا کرنے، گھوڑوں کو تیار رکھنے، اور دیگر وسائل مہیا کرنے کا حکم دیا ہے، ہمیں اس کو سمجھنا چاہیے اور اسے اپنی حکمت عملی میں مرکزی اہمیت دینا چاہیے۔

۳- **اُمت کی وحدت:** بظاہر یہ ایک مشکل کام دکھائی دیتا ہے لیکن وحدت اور اپنی قوت کو مجتمع کرنا اشد ضروری ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ مسلم ممالک کے لیے فرداً فرداً اس سیلاب بلا کا مقابلہ مشکل ہے۔ بقا کا ایک ہی راستہ ہے کہ سب مل کر حالات کا مقابلہ کریں۔ اس سلسلے میں دینی قوتوں کا اتحاد پہلی ضرورت ہے لیکن یہ بھی کافی نہیں۔ صرف دین اور اپنی تہذیب کے بقا ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے بھی مسلمان ملکوں کے لیے ناگزیر ہوگیا ہے کہ مل جل کر حالات کا مقابلہ کریں ورنہ خطرہ ہے کہ "تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!"

ان اصولی لیکن عملی اعتبار سے فیصلہ کن (crucial) بنیادوں کی وضاحت کے بعد ہم مطلوبہ نقشہ کار کے خدوخال کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں لیکن آگے بڑھنے سے پہلے دو بہت ہی اہم امور کو ایک بار پھر بہت صاف الفاظ میں بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ان پر ساری نظری اور عملی حکمت عملی کی کامیابی کا انحصار ہے۔

صاحب دعوت اُمت

اولاً ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ایک صاحب دعوت اُمت ہیں اور مقابلے کے لیے قوت کوئی بھی ہو اور مقابلے کا زمانہ کچھ بھی ہو، ہمارا مقصد دشمن کی تباہی نہیں، انسانیت کی اصلاح اور فلاح ہے اور اللہ کے بندوں کو، خواہ وہ کہیں بھی ہوں اور کسی بھی نظام کے تحت ہوں بالآخر اللہ کے راستے کی طرف لانا ہے۔ مقابلے، لڑائی اور جنگ میں بھی ہمارا مقصود دوسروں کی تباہی نہیں، ان کو خیر کی طرف بلانا ہے۔ اسی لیے آج امریکہ کے استعماری عزائم، فکری اور ثقافتی یلغار، معاشی شکنجوں اور جنگی کارروائیوں تک کے مقابلے میں ہمیں یہ بات سامنے رکھنی چاہیے کہ امریکی عوام کی تباہی ہمارا ہدف نہیں۔ پھر آج کی سوسائٹی کی جو ساخت ہے، اس میں امریکہ محض وہاں کی موجودہ قیادت اور انتظامیہ کا نام نہیں۔ خود اس معاشرے میں متعدد قوتیں برسرکار ہیں اور ان میں خیر اور شر دونوں عناصر موجود ہیں۔ ایک صاحبِ دعوت اُمت اور ایک داعی الی الخیر قوم کی حیثیت سے ہمیں کوئی جذباتی یا یک رخا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے ڈائیلاگ کا راستہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے اور بگاڑ کو محدود کرنے کے لیے جہاں کہیں سے ہمیں معاون و انصار مل سکیں اس کی ہمیں اتنی ہی فکر کرنی چاہیے جتنی اپنے حقیقی دفاع کی۔ ہر معاشرے میں کچھ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں اور ہر ملک میں کچھ اچھے نفوس بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے مسلم اُمت کی دفاعی اور جنگی دونوں حکمت عملیوں کی بھی ایک امتیازی شان ہونی چاہیے اور عمومی تباہی کبھی ہمارا طریقہ نہیں ہوسکتا۔ شرِ محض کا کوئی وجود نہیں اور خیر جہاں بھی ہو اور جس درجے میں ہو اس کو ہمیں اپنا اثاثہ بنانا چاہیے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمت عملی، جنگی نقشہ کار اور سفارت کاری میں ہمیں

مقابلے اور مذاکرے کا ایک حکیمانہ امتزاج نظر آتا ہے۔ اسے آج بھی ہماری حکمت عملی کا امتیاز ہونا چاہیے۔

کثیر جہتی حکمت عملی

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ امریکہ جس طرح آج اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ بھی کوئی یک رخی (one dimensional) جنگ نہیں ہے۔ بلاشبہہ اس کی عسکری قوت اور فوجی بالادستی اس نقشہ جنگ میں مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ آج امریکہ کی فوجی قوت دنیا کے باقی تمام ممالک کی مشترک فوجی استعداد سے بھی زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جس ملک پر چاہتا ہے، چڑھ دوڑنے کے لیے تیار ہے اور ایک کے بعد دوسرے کو نشانہ بنانے کے منصوبے بنا رہا ہے اور اقوام متحدہ کو بھی اپنی باندی سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ لیکن یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ یہ جنگ بس ایک عسکری معرکہ ہے۔ نئے استعمار کے دوسرے رُخ ---فکری، معاشی، تہذیبی اور ابلاغی بھی اتنے ہی اہم اور نئی غلامی کی زنجیروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلے کی حکمت عملی کو بھی کثیر جہتی (multi-dimensional) ہونا چاہیے۔ ورنہ جس یلغار کی زد میں ہم ہیں اس کا مقابلہ ممکن نہیں ہوگا۔

ہماری حکمت عملی میں ان دونوں پہلوؤں کا پورا پورا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ ہماری نگاہ میں پاکستان اور اُمت مسلمہ کو آج جس حکمت عملی کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اس کے تین پہلو ہیں--- ا- نظریاتی اور اخلاقی ۲- تزویری اور اداری (structural and institutional) ۳- اطلاقی (operational)۔ ہم ان تینوں کے بارے میں چند گزارشات پیش کر رہے ہیں:

نظریاتی اور اخلاقی اساس

ہماری حکمت عملی کی اساس محض مفاد اور وقتی مصالح نہیں ہو سکتے۔ ملک کا مفاد، اُمت کا مفاد، بلکہ انسانیت کا مفاد بلاشبہہ اس کا ایک اہم حصہ ہے اور وقتی مصالح سے بھی صرف وہی صرفِ نظر کر سکتا ہے جس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں۔ لیکن کسی مسلمان، کسی مسلمان ملک اور

بحیثیت مجموعی اُمت مسلمہ کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ان کی حکمت عملی کی اساس ان کا ایمان، ان کا نظریہ، ان کا تہذیبی مشن اور ان کی اخلاقی استعداد ہو۔ اس لیے ہم جو بھی راستہ اختیار کریں اور جو بھی منصوبہ کار تیار کریں اس میں سب سے پہلی چیز اللہ سے تعلق، اپنے خلیفۃ اللہ ہونے کا شعور اور خیراُمت کی حیثیت سے اپنے تاریخی رول کا ادراک ہے۔

۱- **استعانت باللہ:** یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ کی بقا اور اس کے احیا کے لیے جو حکمت عملی بھی وضع کی جائے گی اس کا اولیں نکتہ استعانت باللہ ہے۔ اقبال نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ اس پوری تاریخ میں مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا بلکہ اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مادی قوت، فکری تحرک، عسکری اور سائنسی طاقت سب ضروری ہیں لیکن سب سے اہم چیز اللہ سے تعلق، اللہ کی مدد اور اسلام کی رسّی کو تھامنا ہے۔ نقطۂ آغاز ایک اور صرف ایک ہے:

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُم ...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ ۲:۱۵۶)

جب ان پر تکلیف دہ مصیبت حملہ آور ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں--- بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ .... فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران ۳:۱۶۰)

اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکے گا اور اگر وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے؟ اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔

۲- **اصلاحِ ذات:** اُمت کی ترقی کا کوئی راستہ محض وسائل کی فراوانی سے استوار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کوئی میکانکی عمل نہیں۔ اس میں اصل قوتِ کار مسلمان مرد اور مسلمان عورت ہے۔ ان کی حیثیت عمارت کی تعمیر میں استعمال ہونے والی اینٹوں کی ہے۔ اگر یہ اینٹیں کمزور اور خستہ ہوں گی تو عمارت مضبوط کیسے ہوگی؟

ذات کی فکر اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم تونمند ہو جائیں اور مال دار بن جائیں۔ بلاشبہہ اچھی صحت اور مالی قوت بھی درکار ہے، لیکن اصل قوت راسخ ایمان اور مضبوط کردار کی ہے۔ انفرادی تزکیے اور سیرت سازی کے ذریعے ہی اس اُمت کا ہر فرد اُمت کی قوت کا ذریعہ بن سکتا ہے اور پھر یہ گروہ ایک ایسا گروہ بن سکتا ہے جو لوہے کے چنوں کی مانند ہو کہ کوئی آپ کو چبا نہ سکے اور کوئی چبانے کی کوشش کرے تو اپنے دانت تڑوا بیٹھے۔

۳- دعوت الی اللّٰہ: دعوت الی اللہ ہی اُمت کو بیدار اور متحرک کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اس کے ذریعے ہم دنیا کے دوسرے لوگوں تک ایک پیغام کے علم بردار بن کر پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس کو اختیار کر کے اُمت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رواج ہو سکے گا اور معاشرے کی اصلاح واقع ہو سکتی ہے۔ اس سے تعلیمی ترقی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ معاشرے کو متحرک اور تیار کیے بغیر مسلمان عسکری، سیاسی اور معاشی چیلنج کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ خاندان، معاشرہ اور اجتماعیت ان سب کی قلب ماہیت اگر ہو سکتی ہے تو دعوت الی اللہ کو مرکز و محور بنا کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن سے ربط و تعلق اور اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنا اور سیرت پاکؐ سے نسبت اور حضورؐ کی محبت اور اطاعت کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کام باہر نکلے اور لوگوں تک پہنچے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن اور سیرت نبویؐ سے جو سبق ہم سیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے عوام تک پہنچیں۔ انھیں بیدار کرنے اور ان کے اخلاق سنوارنے کے لیے سب مل جل کر کام کریں۔ جب تک ہم سب دعوت کے اس عمل میں مصروف اور متحرک نہیں ہو جاتے، اُمت کو وہ قوت میسر نہیں آ سکتی جس سے وہ بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکے۔

۴- رواداری اور اخوت: اختلافات کے سلسلے میں برداشت اور تکثر (plurality) کی حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرنا اور رواداری اور اخوت کی کیفیت پیدا کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ لازمی ہے کہ ہم اپنے دینی، سیاسی اور تہذیبی اختلافات کو حدود میں رکھنا سیکھیں اور اختلاف مسلک کو جنگ و جدال اور تصادم کا رنگ نہ دیں۔ ضروری ہے کہ یہ احساس پیدا کیا جائے کہ دین کے دائرے میں بھی فطری اختلافات لائق احترام ہیں۔ دوسرے الفاظ میں

برداشت' افہام و تفہیم' ایک دوسرے کو قبول کرنا ہمارا طریقہ ہو۔ اس لیے کہ اُمت کی وحدت اگر قائم ہوسکتی ہے تو وہ ایمان کے بعد ایک دوسرے کو قبول کرنے سے اور ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چلنے سے ہوسکتی ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب مسلم قیادت' اپنی ذات سے بلند ہوکر اختلاف کو حدود میں رکھنا سیکھے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے درمیان تین روایات کو پروان چڑھانا ہوگا یعنی اختلاف کے باوجود باہم متحد رہنے کا جذبہ' دوسرا افہام و تفہیم کے جذبے سے مسلسل مکالمہ اور تبادلہ خیال اور تیسرے مشاورت اور نصیحت کے نظام کا احیا۔ مشاورت کا دائرہ صرف اپنے تک ہی محدود نہ رہے بلکہ مشاورت کے دائرے کو زندگی کے تمام شعبوں میں رواج دیں۔

حکمت عملی کے یہ چار نظریاتی اور اخلاقی ستون ہیں جنھیں اساسی مقام دینا ناگزیر ہے۔

تزویری اور اداری دائرے

حکمت عملی کا دوسرا دائرہ تزویری اور اداری ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان ملک اور بحیثیت مجموعی اُمت مسلمہ کو اپنے نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ ان پہلوؤں کو محض وسطی مدت یا لمبی مدت کی اصلاحات کے نام پر معرض تعویق میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ ان اصلاحات کی فوری ضرورت ہے اور اس باب میں ایک ایک دن کی تاخیر بھی ملک و ملت کو بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔

۱- **اظہار کی آزادی:** اس سلسلے کی سب سے پہلی ضرورت آزادی اظہار اور بنیادی انسانی حقوق کا' جن کی ضمانت اسلام دیتا ہے' غیر مشروط تحفظ ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو سوچنے' سمجھنے والے ذہنوں پر قفل لگاتا ہے' اظہارِ خیال' افہام و تفہیم' بحث و مذاکرے کے مواقع سے اپنے ہی لوگوں کو محروم رکھتا ہے اور اصل حقائق اور رجحانات کو جاننے' سمجھنے اور ان کی روشنی میں صحیح رویے اختیار کرنے سے احتراز کرتا ہے وہ قوم کی تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو مضمحل کر رہا ہے' اور جھوٹے استحکام کے نام پر فرد اور قوم دونوں کی ترقی کی راہیں مسدود کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تزویری اصلاحات کے باب میں یہ پہلی ضرورت ہے۔

۲- **اپنی قوم پر اعتماد:** دوسری چیز دوسروں کے مقابلے میں اپنی قوم پر اعتماد'

اس کو پالیسی سازی میں شریک کرنا' حقیقی شورائی اور جمہوری نظام کی ترویج اور تمام قومی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں معلومات پر مبنی کھلی بحث (informed debate) اور اجتماعی فیصلہ سازی (decision making) کی روایت کا قیام ہے۔ کسی ایک فرد پر انحصار ہماری سب سے بڑی اور خطرناک غلطی ہوگی۔ مجالس دانش (think tanks) کا قیام' کھلی بحث اور اجتماعی احتساب ہی میں ہماری ترقی اور قوت کا راز مضمر ہے۔

۳- **تعلیم و ٹکنالوجی :** تیسری چیز تعلیم' تحقیق' ایجاد و انکشاف اور مادی وسائل اور ٹکنالوجی کے میدان میں نہ صرف ترقی بلکہ مقابلے کی ترقی ازبس ضروری ہے۔

۴- **خود انحصاری:** چوتھی چیز اصولی طور پر تو ہر دور میں لیکن خالص عملی اعتبار سے آج کی دنیا میں' خصوصیت سے عالم گیریت کے ایسے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے جو ہمیں ہماری معیشت اور ہماری تہذیب کو جڑ سے اکھاڑ دینے پر تلی ہوئی ہے' وہ کچھ دائروں میں ہر مسلمان ملک اور بحیثیت مجموعی اُمت مسلمہ کی خودانحصاری ہے۔ خودانحصاری کے معنی ہر میدان میں خودکفالت نہیں کہ یہ قدرت کی تقسیم وسائل اور صلاحیتوں کے تنوع کے نظام سے مطابقت نہیں رکھتی۔ نہ اس کے معنی دنیا سے کٹنا اور تجارت' معیشت' مالیات' ثقافت وغیرہ کے میدانوں میں دنیا سے الگ تھلگ ہوجانے (autarky) کے مترادف ہے۔ خودانحصاری کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم اپنے بنیادی' معاشی' مالیاتی' سیاسی اور ثقافتی فیصلے کسی دباؤ اور مجبوری کے تحت نہیں بلکہ اپنے تصورات' اقدار' اصولوں اور منصفانہ مفادات کی بنیاد پر کرسکے اور اپنے اندر ایسی فکری' معاشی اور عسکری قوت رکھتی ہو کہ دوسرے اس کے فیصلوں پر ناروا انداز میں اثرانداز نہ ہوسکتے ہوں۔ اس کے برعکس سامراجی نظام کا خاصا یہ ہے' خواہ کسی شکل میں بھی ہو' کہ وہ دوسروں کو دنیا کا محتاج بناتا ہے اور ان کو فیصلے کی آزادی سے محروم کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلامی شخصیت کی نفی کے مترادف ہے اور تاریخ کا سبق بھی یہی ہے کہ جو قوم اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہوسکے اور اس کے وجود کا انحصار دوسروں پر ہو' وہ کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ اُمت مسلمہ کو بھی زمین و آسمان کے خالق نے جو مشن دے کر زمین پر برپا کیا ہے وہ ہے: شھداء علی الناس۔ یہ کردار اور دوسروں کی محکومی یا ان کی محتاجی ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

متحدہ حکمت عملی کی ضرورت

اگر یہ اُمت ہی دوسروں کی ذہنی اور فکری طور پر' نظریاتی اور تہذیبی طور پر' اسلامی اور ثقافتی طور پر' مادی اور سائنسی طور پر' سیاسی اور عسکری طور پر دست نگر ہو جائے تو پھر یہ اپنا تشخص کیسے برقرار رکھ سکتی ہے اور اپنا تاریخی کردار کیسے ادا کر سکتی ہے؟ آج پوری دنیا کو اور خصوصیت سے مسلم ممالک کو جو خطرات درپیش ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اگر وہ سب سر جوڑ کر نہیں بیٹھتے اور مل جل کر ایک دوسرے کی قوت کا ذریعہ نہیں بنتے تو ڈر ہے کہ خدانخواستہ ایک ایک کر کے سب پٹ جائیں گے۔ اگر آج عراق نشانہ ہے تو کل ایران ہوگا اور پرسوں پاکستان' شام' سعودی عرب' انڈونیشیا اور ترکی۔ یہ محض ایک واہمہ نہیں بلکہ آج کی دنیا کے جغ سیاسی (geo-political) حالات پر نظر رکھنے والا ہر شخص اس نقشہ جنگ کو بچشم سر دیکھ سکتا ہے بلکہ یہ نشانہ بازی شروع ہو چکی ہے اور جن ۲۵ ممالک کے شہریوں سے امریکہ میں امتیازی سلوک قانون کے ڈنڈے کے زور سے شروع ہوا ہے ان میں سے ۲۴ مسلمان ملک ہیں اور سرفہرست وہ ہیں جو اپنے کو امریکہ کا حلیف اور تاریخی اعتبار سے دوست سمجھے ہوئے ہیں۔ عراق کے خلاف محاذ محض عراق کے خلاف نہیں بلکہ ایک عالمی جنگ کا نقطۂ آغاز ہے اور سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے۔ ابھی ۱۲ جنوری ۲۰۰۳ء کے واشنگٹن پوسٹ میں صدر بش کی دو صفحات پر مشتمل ایک نہایت خفیہ (top secret) دستاویز شائع ہوئی ہے' جو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعہ سے صرف ۶ دن بعد یعنی ۱۷ ستمبر کو ضبطِ تحریر میں لائی گئی تھی اس میں افغانستان کے خلاف جنگ کی ہدایات کے ساتھ وزارتِ جنگ (Pentagon) کے لیے یہ احکام بھی شامل ہیں کہ:

to begin planning military options for an invision of Iraq.

عراق پر حملے کے لیے عسکری متبادلات کی منصوبہ بندی شروع کرنا۔

اور پھر ۱۷ جنوری ۲۰۰۳ء کو اسی واشنگٹن پوسٹ میں یہ بات بھی آ گئی ہے کہ مقصد عراق کے نام نہاد تباہی کے اسلحے پر قبضہ نہیں بلکہ عراق پر مکمل فوجی قبضہ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان پر قبضے کی طرح امریکی فوج کے حاضر سروس جنرل کے تحت فوجی انتظام و انصرام ہے۔

افسوس کہ ہمارے کمانڈو صدر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا افغانستان اور عراق سے' اور عراق کا ایران' پاکستان اور سعودی عرب سے تعلق (linkage) دیکھنے سے قاصر ہیں اور اس خودفریبی میں مبتلا ہیں کہ ''تجھ کو پرائی کیا پڑی' اپنی نبیڑ تو!'' ہمیں اس خواب سے اب بیدار ہو جانا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ خودانحصاری اور اُمت مسلمہ کی وحدت کے سوا کوئی راستہ کسی کے لیے بھی بچاؤ کا راستہ نہیں۔ ہم مل کر ایک قوت بن سکتے ہیں اور الگ الگ ہر ایک پٹ جائے گا اور خدانخواستہ وہی ہوگا جو دولت عثمانیہ کے انتشار' تقسیم اور علاقائیت کے ہاتھوں ۱۰۰ سال پہلے ہوا یا شمالی عربوں' اور حجازیوں اور یمنی عربوں کی باہمی آویزش اور داخلی نزاعات کے نتیجے میں ۷۰۰ سال پہلے اندلس (اسپین) میں ہوا تھا۔

یہ اتحاد دین و ایمان اور نظریے اور تہذیب کا تقاضا تو ہے ہی' لیکن آج تو یہ بقاے باہمی کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بن گیا ہے۔ مسلم دنیا کے حکمرانوں اور ارباب ثروت کا اپنا مفاد اس میں مضمر ہے کہ وہ امریکہ پر انحصار کو کم کریں اور اپنے معاملات اور اپنے وسائل اپنے تصرف میں لائیں اور مسلم ممالک میں مقابلے کی قوت پیدا کریں۔ ستم ہے کہ اس وقت مسلم ممالک کا ۳.۱ ٹریلین یعنی ایک ہزار تین سو ارب ڈالر کا سرمایہ امریکہ اور یورپی ممالک میں لگا ہوا ہے اور اب اس رقم کو آسانی سے امریکہ اور یورپی ممالک سے واپس لانا بھی مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اس رقم کا نصف بھی مسلم ممالک کی معاشی ترقی کے لیے صحیح ترجیحات کے ساتھ استعمال ہو تو چند سال میں مسلمان ممالک ایک عالمی معاشی قوت بن سکتے ہیں۔ جن ممالک اور افراد کا یہ سرمایہ ہے یہ خود ان کے مفاد میں ہے کہ اس کو مغرب کی گرفت سے نکالیں۔

یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنی گردن ان ممالک کے ہاتھ میں دے دیں اور پھر اپنی آزادی اور خودمختاری کا خواب بھی دیکھیں۔ حالات ہمیں اس مقام پر لے آئے ہیں کہ مسلم ممالک میں معاشی' مالیاتی' تعلیمی' سائنسی' عسکری غرض ان سب میدانوں میں خودانحصاری کے حصول کو اولیت دی جائے۔ اس کے بغیر ان ممالک کے آزاد رہنے اور کوئی مثبت عالمی کردار ادا کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نظریاتی اور اخلاقی اساس پر ایک مضبوط معیشت' مادی وسائل کا حصول' ٹکنالوجی کے میدان میں مقابلے کی مہارت اور عسکری اعتبار سے

اتنی قوت کہ آپ اپنا دفاع موثر انداز میں کر سکیں' پوری اُمت کی اجتماعی ضرورت ہے۔ وسائل موجود ہیں۔ امکانات کی کمی نہیں۔ کمی ہے تو وژن کی' منصوبہ بندی کی' اپنے ہی وسائل کے ٹھیک استعمال کی' سمجھ دار اور باصلاحیت قیادت کی۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اب راستے (options) کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کے اتحاد' مسلمان عوام کی بیداری اور اُمت میں مقابلے کی قوت کو ترقی دینے کے سوا زندہ رہنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان بنیادی تبدیلیوں اور تزویری اصلاحات کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ان کا آغاز بلاتاخیر ہو جانا چاہیے لیکن ان کے پورے اثرات رونما ہونے میں ایک وقت لگے گا۔ فوری تعاون کے راستے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں اور کیے جانے چاہییں لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ تعاون اور ربط باہمی (cooperation and coordination) سے آغاز کر کے اتحاد' انضمام اور انحصار باہمی (unity, integration and inter - dependence) کی طرف مراجعت کی جائے تاکہ ہمارا اتحاد محض اوپری انداز کا نہ ہو بلکہ اُمت مسلمہ اپنے تنوع کو باقی رکھتے ہوئے ایک حقیقی وحدت کی شکل اختیار کر لے۔ اگر یورپ صدیوں کے جنگ وجدال اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہونے کے باوجود مصالح کی بنیاد پر ایک معاشی اور سیاسی وحدت بن سکتا ہے تو مسلمان اُمت کیوں نہیں بن سکتی۔ آج بھی اُمت کے عوام میں ہم آہنگی اور یگانگت ہے' حکمران اور مخصوص مفاد کے پرستار اصل رکاوٹ ہیں۔ لیکن اب یہ خود ان کے مفاد میں ہے کہ اپنے اس خول سے نکلیں اور وہ راستہ اختیار کریں جو اُمت کے اور خود اُن کے حق میں بہتر ہے۔

مسلمان عوام آج بھی ہر مسلم مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں اور جان اور مال سے اس میں شرکت اپنے لیے باعث شرف سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے اس عوامی جذبے کو اجتماعی نظام کی بنیاد بنانا زیادہ آسان ہے۔ اس گئے گزرے دور میں بھی آخر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر ایران اور عرب ممالک ہی نہیں' انڈونیشیا نے بھی بھارت سے اپنے تاریخی تعلقات اور نہرو سوئیکارنو دوستی کی روایات کے باوجود صرف سفارتی میدان میں ہی نہیں' عملی عسکری تعاون کے ذریعے کھل کر پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ۱۱ ستمبر کے بعد پاکستان کی تیل کی ضروریات کو پورا کرنے میں

سعودی عرب اور کویت نے جو تعاون کیا ہے وہ بھی محض خیالی چیز نہیں۔ اس کے باوجود صدر صاحب کا جنوری ۲۰۰۳ء میں لاہور کے دانش وروں کی محفل میں یہ ارشاد کہ ''ہماری مدد کو کون آیا'' ایک غیر حقیقت پسندانہ ارشاد ہے۔

اطلاقی دائرہ

حکمت عملی کا تیسرا اور فوری توجہ کا حصہ اطلاقی (operational) ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز امریکہ سے تعلقات پر نظرثانی ہے۔ امریکہ ایک عالمی قوت بلکہ واحد سوپر پاور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خلاف محاذ آرائی یا تصادم نہ مطلوب ہے اور نہ یہ کوئی راستہ ہے۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ مسلمان ملک فرداً فرداً اور مل کر امریکہ کو ایک پیغام دیں--- ہم دوستی اور تعاون کا راستہ تو اختیار کرنا چاہتے ہیں لیکن کسی ایسے نظام کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے جس میں ایک قوم کی بالادستی سب پر قائم کی جائے۔ شمالی کوریا نے جرأت مندانہ پالیسی کا ایک نمونہ پیش کیا ہے حالانکہ شمالی کوریا ایک غریب ملک ہے جس کی قومی دولت جنوبی کوریا کا بھی صرف چالیسواں حصہ اور تیل اور خوراک دونوں میں باہر کی سپلائی کا محتاج ہے۔ مسلم ممالک اپنے وسائل' جغرافیائی محل وقوع' معاشی دولت' سیاسی وزن (leverage) ہر اعتبار سے کہیں زیادہ موثر قوت بن سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ذاتی مفاد کے چکر سے نکل کر اجتماعی قوت اور فلاح باہمی کا راستہ اختیار کریں۔ اس کے لیے عزم اور وژن کے ساتھ مکالمے اور اجتماعی تحفظ کے لیے سدجارحیت کا راستہ بیک وقت اختیار کیا جائے۔

اس وقت امریکہ نے جن ۲۵ ممالک کے شہریوں کے ساتھ امتیازی سلوک شروع کیا ہے ان میں سے ۲۴ ممالک مسلمان ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر فوری طور پر پہل قدمی کی ضرورت ہے۔ یہ امریکہ سے تعلقات پر نظرثانی کے لیے ایک مناسب نقطہ آغاز ہے۔ بلاشبہہ ہر ملک کو اپنے تحفظ کا اختیار ہے لیکن دہشت گردی کے خطرے کے سدباب کے نام پر کچھ خاص ملکوں کو نشانہ بنانا اقوامِ متحدہ کے چارٹر' انسانی مساوات کے بنیادی اور مسلمہ اصول اور خود امریکی

دستور کی پہلی دفعہ کے خلاف ہے۔ اس پر مستزاد کہ یہ پابندی خصوصی اور امتیازی ہے یعنی دنیا کے ۱۹۰ ممالک میں سے صرف ۲۵ کے خلاف جو بظاہر دوست ملک ہیں اور ان کی عالمی سطح پر امریکہ سے کوئی مخالفت نہیں رہتی۔ بین الاقوامی قانون میں وہ نہ برسرِ جنگ ہیں اور نہ اجنبی (alien) طاقتوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح یہ پابندی جنس کی بنیاد پر امتیاز کی زد میں بھی آتی ہے کہ صرف ۱۶ سال کی عمر کے مردوں پر اس کا اطلاق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دوسری جنگ کے بعد دنیا کے سارے ممالک میں اگر کسی ملک میں امریکیوں کے خلاف دہشت گردی کے سب سے زیادہ واقعات ہوئے ہیں تو وہ یونان ہے مگر وہ اس فہرست میں شامل نہیں۔ اگر معاملہ تارکینِ وطن اور خاص طور پر غیر قانونی تارکینِ وطن کا ہے تو امریکہ کے اپنے ریکارڈ گواہ ہیں کہ ہر سال امریکہ میں ۳۰۰ ملین افراد باہر سے آتے ہیں جن میں سے ۲ ملین واپس نہیں جاتے۔ ان میں سب سے زیادہ لوگوں کا تعلق میکسیکو' پورٹو ریکا' کیوبا اور دوسرے جنوبی امریکہ کے ممالک سے ہے لیکن یہ سب اس فہرست سے باہر ہیں۔ اس لیے سیاسی اور قانونی دونوں محاذ پر اس قانون اور مسلمانوں پر اس کے اطلاق کے خلاف ایک عالم گیر مہم چلانی چاہیے۔

اسی طرح عراق کی جنگ کا مسئلہ اس لیے اہم ہے کہ عراق تو ایک عالمی استعماری جنگ کے آغاز کا صرف عنوان ہے۔ اصل مسئلہ اصول کا ہے کہ کیا بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے چارٹر سے بالا ہو کر امریکہ یا اس کے کسی اتحادی ملک کو یہ حق حاصل ہے کہ محض کسی خیالی خطرے کا سہارا لے کر پیش بندی (pre-emptive strike) کے نام پر (جس کا بین الاقوامی قانونِ جنگ و صلح میں کوئی مقام نہیں) ایک دوسرے خودمختار ملک پر جو اقوامِ متحدہ کا رکن بھی ہے' فوج کشی کر سکتا ہے۔ کیا کسی ملک کی حکومت بدلنے کے لیے کسی دوسرے ملک پر فوج کشی' قیادت کے قتل یا بغاوت کو منظم کرنے کا کوئی جواز ہے۔ اسی طرح کیا کسی بھی ملک کو اس بنیاد پر کہ اس کے پاس مہلک ہتھیار ہیں' نشانہء جنگ بنایا جا سکتا ہے۔ عراق ایک کمزور ملک ہے۔ وہ کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں' اس کے تیل کے ذخائر استعماری طاقتوں کا اصل ہدف ہیں۔

یہ وہ بنیادی ایشوز ہیں جو آج معرضِ خطر میں ہیں۔ اگر دنیا کے دوسرے ممالک اور خصوصیت سے مسلم اور عرب ممالک خود کو ان فوجی جولانیوں اور جنگی تباہیوں سے محفوظ رکھنا

چاہتے ہیں تو آج عراق پر امریکہ کی دست درازی کو روکنا اس کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوری ۲۰۰۳ء کے وسط میں دنیا کے ۲۵ ممالک میں امریکہ کے جنگی عزائم کے خلاف عوامی مظاہرے ہوئے ہیں اور خود واشنگٹن، نیویارک، لاس اینجلز اور سان فرانسسکو جنگ کے خلاف نعروں سے گونج رہے ہیں۔ جرمنی اور فرانس نے بھی موثر احتجاجی آواز بلند کی ہے اور روس اور چین بھی اس صورتِ حال پر مضطرب ہیں۔ صرف اسرائیل اور بھارت اپنے استعماری عزائم کی وجہ سے بش کا ساتھ دے رہے ہیں۔ امریکہ کے سابق صدر کلنٹن بھی کھل کر اس جارحیت کے خلاف شکایت کناں ہیں لیکن اس جارحیت کا اگلا ہدف بننے والے مسلم ممالک منقار زیرِ پر ہیں۔ یہ وقت جاگنے، احتجاج کرنے اور خارجہ پالیسی کو نئے خطوط پر استوار کرنے کا ہے۔ اس کے لیے پاکستان اور تمام مسلم ممالک کو بروقت اقدام کرنا چاہیے۔

مکالمے کا آغاز: دوسری فوری ضرورت امریکہ اور پوری مغربی دنیا سے معنی خیز مکالمے کا آغاز ہے جس میں صرف حکومتیں ہی نہیں، ان ممالک کے تمام موثر عناصر اور عوام مخاطب اور شریک ہوں۔ اس کے لیے میڈیا کی قوت کا استعمال ازبس ضروری ہے۔ آج دنیا کے ذہنوں پر امریکی میڈیا چھایا ہوا ہے جو خود پنجۂ یہود میں ہے۔ الجزیرہ ٹی وی چینل کی ایک ننھی سی آواز ہے جس نے عرب دنیا میں کچھ آگاہی پیدا کی ہے لیکن ضرورت ایک ایسے طاقت ور میڈیا کی ہے جو مسلم ذہن اور عالم اسلامی کے جذبات اور مفادات کا ترجمان ہو لیکن یہ نہ محض سرکاری آواز ہو اور نہ ابلاغ کے جدید ترین اسالیب سے محروم۔ یہ وسائل ہمارے پاس ہیں۔ پاکستان نے حال ہی میں خود اپنا سیٹلائٹ فضا میں آویزاں کیا ہے جو اعلیٰ پیشہ ورانہ انداز میں ہماری آواز پوری دنیا تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم اپنی سیاسی بازی محض اپنی بے تدبیری اور بے عملی کی وجہ سے ہار رہے ہیں جسے انگریزی محاورے میں loosing by default کہا جاتا ہے۔ اس کی تلافی کی فوری ضرورت ہے اور یہ کام مناسب منصوبہ بندی سے انجام دیا جائے تو مہینوں نہیں، ہفتوں میں شروع ہوسکتا ہے۔

ہمیں یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ مسلم دنیا کے اتحاد کے ساتھ دنیا کے ان تمام ممالک، اقوام اور گروہوں کو ہمیں اپنے ساتھ ملانا چاہیے جو آزادیوں کے تحفظ، استعمار کے خلاف

جنگ، بین الاقوامی قانون کی پاس داری، انصاف کے قیام کے مقاصد کے حصول کے لیے ہمارے معاون ہو سکتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں ان کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر انھیں مناسب طور پر منظم اور استعمال کیا جائے تو یہ ساری قوتیں اس جدوجہد میں ہماری حلیف اور ساتھی ہیں اور مزید بن سکتی ہیں۔ مکالمے کا ایک کردار یہ بھی ہے کہ جہاں ہم حکومتوں سے مذاکرات کریں، وہیں ہر دوسری سطح پر افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع کریں اور اس طرح دنیا کو سب کے لیے ایک زیادہ پُرامن اور منصفانہ مسکن بنانے کی خدمت انجام دے سکیں۔

معاشی و عسکری منصوبہ بندی: تیسری ضرورت مکالمے کے ساتھ سیاسی، معاشی اور عسکری محاذوں پر ایسی منصوبہ بندی اور تنظیم کی ہے جو کمزور ممالک کے خلاف جنگی یلغار یا انھیں مغلوب کرنے کی چالبازیوں کے مقابلے میں سدجارحیت کا کردار ادا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نگاہ میں وقت کی اہم ترین ضرورت مغرب پر انحصار کو ختم کرنا، مغرب سے موثر اور معنی خیز مکالمہ شروع کرنا اور خودانحصاری کی بنیاد پر اپنی سدجارحیت کی طاقت کو وجود میں لانا ہے۔ یہ کام ٹھوس منصوبہ بندی اور مسلسل جدوجہد کا متقاضی ہے۔ اس کے لیے معاشی اور عسکری قوت اور اپنے وسائل پر اپنی گرفت ضروری ہے۔ نہ ہم اتنے کمزور ہیں کہ بس گھٹنے ٹیکتے چلے جائیں اور نہ اتنے قوی ہیں کہ فوری تصادم کا خطرہ مول لے سکیں۔ اس لیے استقامت اور حکمت سے راستہ نکالنے ہی میں اُمت کی نجات ہے۔ اس کے لیے جہاں نظریاتی استحکام ضروری ہے وہیں مادی قوت کا حصول اور اس کا صحیح صحیح استعمال بھی ضروری ہے۔ خطرات کا صحیح شعور اولیں شرط ہے لیکن بلاتیاری مقابلہ اور تصادم کے راستے کو اختیار کرنا بھی خودتباہی کا راستہ ہے۔ اس لیے جو بھی نقشہ کار وضع کیا جائے اسے پوری حکمت، دانائی اور مومنانہ فراست سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

معاشی ترقی کا کریش پروگرام: اس سلسلے کی آخری چیز صحیح معاشی منصوبہ بندی اور مسلم ممالک میں ایک ہمہ گیر معاشی ترقی کا کریش پروگرام ہے۔ جس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کی معاشی بحالی کے لیے مارشل لا پلان بنایا گیا تھا اسی طرح اس وقت اسلامی دنیا میں معاشی ترقی، جدید ٹکنالوجی میں قوت کے حصول، بنیادی صنعتوں اور سرمایے کی

تخلیق (asset creation) کے مقاصد کے لیے فوری اقدام درکار ہیں۔ مسلم سرمایے کو محفوظ کرنے کا بھی یہی ذریعہ ہے کہ وہ مسلم ممالک میں سرمایے کی تخلیق کے لیے استعمال ہو۔ ترکی کے ایک صاحب نظر سابق وزیراعظم نجم الدین اربکان کی پہل قدمی پر D-8 کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اب وقت ہے کہ فوری طور پر اس وژن پر عمل ہو اور اسلامی ترقیاتی بنک، او آئی سی، اسلامک چیمبر آف کامرس اور دوسرے متعلقہ ادارے فوری طور پر ان ممالک میں متقابل فوائد اور تقسیم کار کے معاشی اصولوں کی روشنی میں معاشی ترقی کا ایک ماسٹر پلان بنائیں اور اس پر عمل شروع کریں۔ کم از کم ۸ مسلمان ملک ایسے ہیں جن کے پاس جدید ٹکنالوجی اس حد تک موجود ہے کہ وہ مسلم دنیا کے لیے ایک مضبوط اور وسیع صنعتی اساس تعمیر کر سکتے ہیں اور مسلم ممالک خود وسیع مارکیٹ ہیں جو اس کو معاشی استحکام دے سکتے ہیں۔ آج ایسے صاحب نظر لوگوں کی ضرورت ہے جیسے یورپ کو گائی مولے، ڈی گال اور کونارڈ ایڈینور کی شکل میں میسر آ گئے تھے۔ کسی بھی اطلاقی منصوبے کا یہ ایک نہایت اہم حصہ ہے۔

پاکستانی قیادت کا مطلوب کردار

آخر میں ہم یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان اور اس کی قیادت ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھے اور امریکہ کی خدمت میں درخواستیں بھیجنے کا رویہ ترک کرے۔ ایک باوقار ملک کی حیثیت سے اور امریکہ کے سابقہ ریکارڈ کی روشنی میں اپنی خارجہ اور معاشی پالیسیوں کی تشکیل نو کرے۔ قوم پر اعتماد کرے اور اکتوبر کے انتخابات (خواہ وہ کیسے بھی خام کیوں نہ ہوں) کے نتیجے میں قائم ہونے والی پارلیمنٹ اور جمہوری اداروں کو طاقت ور کرے۔ انھیں ذریعہ بناتے ہوئے قومی بیداری پیدا کرنے اور دُور رس نتائج کی حامل نئی پالیسیاں تشکیل دینے کا یہ ایک تاریخی لمحہ ہے اور اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہم یہ کلیدی کردار اسی وقت ادا کر سکتے ہیں جب ملک کی سیاسی اور عسکری قیادت ذاتی مفادات سے بالا ہو کر افہام و تفہیم کے ذریعے بنیادی امور پر ایک قومی اتفاق رائے پیدا کرے اور پھر دوسرے سارے ممالک کو ایک ایسے مرکزی پروگرام پر مجتمع کرنے کی کوشش کرے جس سے عالم اسلامی اپنی آزادی، معاشی وسائل

اور نظریاتی تشخص کی قرار واقعی حفاظت کر سکے اور عالمی سطح پر انصاف کے قیام اور ایک ایسے عالمی نظام کے فروغ کے لیے سرگرم ہو سکے جو انسانیت کو جنگ' تباہی اور معاشی لوٹ کے موجودہ نظام سے نجات دلا سکے اور سب کے لیے عزت' آزادی اور انصاف کا ضامن ہو سکے۔ آج یہ صرف مسلمانوں ہی کی ضرورت نہیں انسانیت کی بھی ضرورت ہے۔ پاکستان اکیسویں صدی کو امن و انصاف کی صدی بنانے کے لیے ایک موثر کردار ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ ہماری قیادت اپنے ذاتی مفادات کے خول سے نکلے اور اُمت مسلمہ اور انسانیت کو درپیش خطرات کا استقامت اور حکمت سے مقابلہ کرنے کا راستہ اختیار کرے۔

(جنوری ۲۰۰۳ء کے اشارات ''موڈریٹ اسلام'' کی تلاش اور اس ماہ کے اشارات ''امریکی عزائم اور مقابلے کی حکمت عملی'' کے عنوان سے یک جا دستیاب ہیں۔ قیمت: ۹ روپے)۔

رحم، رحم، میرے رب، رحم!

میں، میدانِ عرفات میں کھڑا ہوں، محمد رسول اللہؐ کا ایک اُمتی

اُمت میرے سامنے ہے --- پیرو جواں، مرد و عورت، کالے گورے، گندمی، پیلے، مضبوط ایمان والے، کمزور ایمان والے سب رو رہے ہیں، گڑگڑا رہے ہیں، رب کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے پکار رہے ہیں، لبيك لبيك، اللهم لبيك، سب کفن پوش ہیں

میرے ذہن پر اُمت کی تصویر چل رہی ہے

یہ گجرات ہے، یہ چیچنیا ہے، اراکان ہے، منڈاناؤ ہے، کشمیر ہے، یہ فلسطین ہے، یہ عراق ہے

گھر اور انسان جلائے جا رہے ہیں، عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں، نوجوانوں کو عذاب دیے جا رہے ہیں............ ایک نہ ختم ہونے والی کہانی

کیوں ہو رہا ہے؟ میرے رب ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

متٰی نصراللہ

کیا ہماری عزت کے دن نہیں آئیں گے؟ کب آئیں گے میرے رب؟؟

عزت تو تیرے لیے ہے میرے رب، اور تیرے رسولؐ کے لیے اور ایمان لانے والوں کے لیے--- پھر ایسا کیوں ہے!

اُمت میں، بیداری کی ایک لہر ہے

ترکی ہو، انڈونیشیا ہو، مصر ہو، یمن و بحرین ہو، نائیجیریا ہو، مراکش ہو، میرا پاکستان ہو--- ہر جگہ مسلمان نوجوان، بوڑھے، مرد، عورتیں اللہ کی طرف، اس کے کلام کی طرف، اس کے پیغام کی طرف رجوع کر رہے ہیں، اس کے لیے کھڑے ہیں

انسانیت اسی نظامِ عدل و قسط کی پیاسی ہے

یقیناً کش مکش کا دور ختم ہوگا، غلبۂ اسلام کا دور آئے گا، ضرور آئے گا

الا ان نصراللہ قریب

میدانِ عرفات میں کھڑا ایک اُمتی--- میں یہی سوچ رہا ہوں، یہی دیکھ رہا ہوں

اے رب، اُمت کے حال پر رحم فرما--- رحم فرما میرے رب!!

(خیر خواہ)

شذرات

پروفیسر خورشید احمد

مفت تعلیم کی طرف ایک قدم

جمہوریت کی برکات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حکومتوں کو عوام کی خواہشات اور ضروریات کا کچھ نہ کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے اور اگر جواب دہی کا موثر نظام موجود ہو تو یہی چیز وسائل کے بروقت استعمال اور عوام کی مشکلات کے حل کا اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ آمریت کے ادوار میں تو ساری توجہ ورلڈ بنک' آئی ایم ایف اور فوجی اور سول بیوروکریسی کی دل پسند ترجیحات پر مرکوز رہتی ہے' لیکن جیسے ہی الیکشن کے آثار رونما ہوتے ہیں فوجی حکومت بھی عوام کے لیے سہولتوں کی باتیں (کم از کم باتیں) کرنے لگتی ہے اور الیکشن کے نتیجے میں رونما ہونے والی حکومتیں تو بڑھ چڑھ کر عوام کے مسائل ہی کو اپنی ترجیح بتاتی ہیں۔ اعلانات کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اسی وقت خوش آیند ہے جب ان پر عمل ہو اور صرف نمایشی اقدامات پر قناعت نہ کی جائے' بلکہ حقیقی مسائل کو وسائل کے موثر استعمال' صحیح ترجیحات اور بدعنوانی کو لگام دے کر حل کیا جائے۔

اس پس منظر میں پنجاب کی صوبائی حکومت کا اپنی کابینہ کے پہلے ہی اجلاس میں (۴ جنوری ۲۰۰۳ء) یہ اعلان کہ صوبے میں میٹرک تک سرکاری اور ضلعی اداروں میں تعلیم مفت ہوگی' تازہ ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا ہے۔ سرحد کی حکومت نے بھی اپنی دوسری اصلاحات کے ساتھ جن میں وی آئی پی کلچر کا خاتمہ اور فحاشی اور بے راہ روی پھیلانے والے چند اقدامات پر

گرفت اور اُردو کو سرکاری زبان بنانا شامل ہیں' میٹرک تک مفت تعلیم کا اعلان (۲۱ جنوری ۲۰۰۳ء) کر دیا ہے۔ ہم ان اقدامات کا خیرمقدم کرتے ہیں اور انھیں مستقبل کے لیے ایک نیک فال تصور کرتے ہیں۔ ہم اس توقع کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ باقی دو صوبوں کی حکومتوں کو بھی اس سلسلہ میں جلد اقدام کرنا چاہیے' تاکہ پورے ملک میں سرکاری اور ضلعی حکومت کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں میں میٹرک تک تعلیم مفت ہو اور ملک کے طول و عرض میں کم از کم اس محدود میدان میں یکسانی پیدا ہو۔ ہم ان اِقدامات کی خوش الحانی پر مایوسی کا کوئی سایہ ڈالنا نہیں چاہتے لیکن صرف امر واقعہ کے طور پر یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے نام نہاد عوامی دور کا آغاز جن چند اقدامات سے کیا تھا' ان میں ملک بھر میں میٹرک تک مفت تعلیم بھی شامل تھی لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اصل میزان عمل ہے' اعلان نہیں اس لیے اب ان منتخب حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ اس فیصلہ پر لفظ و معنی ہر دو اعتبار سے پورا پورا عمل کروائیں۔

اس اقدام کی تحسین کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان حکومتوں کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ تعلیم کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ سرکاری اسکولوں میں پرائمری تعلیم مفت ہے اور میٹرک تک تعلیم کے لیے ۵ روپے ماہانہ سے ۲۰ روپے ماہانہ تک فیس ہے۔ اس رقم کا بوجھ غریب عوام کی پشت سے اگر کم ہو جائے تو یہ اچھا ہے لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ فروغ تعلیم کے لیے یہ اقدام مشکل کشا ہوگا تو بڑا گمراہ کن ہوگا۔ غریب بچوں پر سرکاری اسکولوں میں فیس کے علاوہ سب سے زیادہ بوجھ کتابوں اور اسٹیشنری کا ہے جو فیس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال ہر بچے کے والدین پر آٹھ سو سے ایک ہزار روپے تک کا بوجھ اس عنوان سے پڑتا ہے۔ پھر یونیفارم کا مسئلہ ہے' ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے چندہ ہے' پورے دن کے اسکولوں میں بچوں کی خوراک بھی ایک مسئلہ ہے۔ مفت تعلیم اسی وقت مفت ہو سکتی ہے جب ان سب کی ذمہ داری ریاست اور معاشرہ لے جو اس کا فرض ہے۔ بنیادی تعلیم ایک حق ہے جسے کاروباری ذہن سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سب بجا' لیکن سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں تعلیم کا معیار اتنا

پست اور تعلیمی سہولتوں (بلڈنگ' صفائی' روشنی' پانی' لائبریری' اچھا استاد وغیرہ) کی فراہمی ایسی زبوں حالی کی تصویر پیش کرتی ہے کہ اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نجی اداروں کی جو ریل پیل ہے اس کی اصل وجہ سرکاری اور ضلعی انتظام میں چلنے والے تعلیمی اداروں کی بدحالی ہے۔ غریب سے غریب انسان بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے ان اداروں کو قتل گاہیں سمجھتا ہے اور پیٹ کاٹ کر اور قرض لے کر اپنے بچوں کو پرائیویٹ اداروں میں بھیجنے کی فکر کرتا ہے۔ اصل مسئلہ سرکاری تعلیمی اداروں کے معیار' ان کی بلڈنگ اور سہولتوں اور سب سے بڑھ کر اچھے تربیت یافتہ اور جذبے سے بھرپور اساتذہ کی فراہمی ہے۔ جب تک اس لحاظ سے صورتِ حال درست نہیں ہوتی عوام کا رجوع سرکاری تعلیمی اداروں کی طرف نہیں ہوسکتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ محکمہ تعلیم تک کے افسر اپنے بچوں کو سرکاری تعلیمی اداروں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے؟ اصل مسئلہ سرکاری تعلیم اور نجی تعلیمی اداروں کے تعلیمی معیار کے تفاوت کو دُور کرنا ہے اور جب تک آپ سرکاری تعلیمی اداروں کو اتنا پُرکشش نہیں بناتے کہ والدین نجی اداروں کا رُخ نہ کریں' تعلیم کا مسئلہ علیٰ حالہ باقی رہے گا اور گھمبیر تر ہوتا جائے گا۔

پھر تعلیمی پالیسی کے مسائل بھی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ نجی تعلیمی اداروں کو قومی تعلیمی پالیسی کے فریم ورک میں لانا' ان کے لیے نگرانی کا ایک موثر نظام بنانا' خصوصیت سے نظریاتی اور ثقافتی معاملات میں بہت ضروری ہے۔ آج ہمارے ملک میں ایک نہیں کئی کئی تعلیمی نظام چل رہے ہیں' کچھ اشراف اور متمول گھرانوں کے لیے اور کچھ مجبور اور بے وسیلہ طبقوں کے لیے۔ یہ چیز قوم کو نظریاتی' اخلاقی' معاشی اور ثقافتی حیثیت سے ٹکڑوں میں بانٹ رہی ہے۔ اس سے طبقاتی تفاوت ہی پیدا نہیں ہو رہا' طبقاتی جنگ کے لیے بھی زمین ہموار ہو رہی ہے۔ نجی دائرے میں بے مہار انداز کے پبلک اسکول' اور کونونٹ اسکول ہی کم مصیبت نہ تھے کہ انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم بنانے اور بیرونی تعلیمی نظاموں (اولیول/اے لیول) سے رشتہ جوڑنے کے نتیجے میں ہمارے تعلیمی ادارے ایک ایسی نسل تیار کر رہے ہیں جن کے فکر و نظر اور جذبات و احساسات کا رشتہ ملک سے باہر جڑ رہا ہے۔ وہ اپنے وطن اور اپنے گھر میں اجنبی بنتے جا رہے ہیں۔ تعلیمی معیار اور تعلیمی پالیسی کے یہ مسائل فوری توجہ کے محتاج ہیں اور ہم توقع رکھتے ہیں مرکزی اور

صوبائی حکومتیں ان کی طرف فوری توجہ دیں گی۔

پاکستان کی سیاست میں ایجنسیوں کا عمل دخل

مرکز اور صوبہ سندھ میں آنکھ مچولی کے مختلف کھیلوں کے بعد بالآخر ایم کیو ایم نے جنرل پرویز مشرف کی ذاتی مداخلت کے نتیجے میں اپنا گورنر مقرر کرا لیا اور صوبائی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس وقت ہمارا موضوع ایم کیو ایم کا کردار نہیں' بلکہ ملک کی سیاست میں فوجی ایجنسیوں کا کردار ہے جس کا سب سے نمایاں سرٹیفکیٹ خود جناب الطاف حسین نے اپنے گورنر کے تقرر اور سندھ کی حکومت بننے پر ان الفاظ میں دیا ہے۔ انھوں نے نام لے کر اپنی اس کامیابی کا سہرا جنرل پرویز مشرف (چیف آف اسٹاف)' جنرل احسان الحق (آئی ایس آئی کے ڈائرکٹر جنرل)' میجر جنرل احتشام ضمیر (آئی ایس آئی کے ڈپٹی ڈائرکٹر) اور جنرل مشرف کے بیوروکریٹ معاون طارق عزیز کے سر باندھا ہے اور ان کا نہ صرف شکریہ ادا کیا ہے بلکہ انھیں اس عظیم خدمت پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اور ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ کم از کم اس بات کی حد تک الطاف حسین صاحب نے اصل حقائق کو بلا کم و کاست کھلم کھلا بیان کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج وہ اس پر ممنونیت کا اظہار کر رہے ہیں اور کل وہ انھی ایجنسیوں کو سب وشتم کا نشانہ بنا رہے تھے اور ان کے خون کے پیاسے تھے۔ صرف ریکارڈ کی خاطر عرض ہے کہ ایم کیو ایم کی سرکاری ویب سائٹ پر فوج' اس کی قیادت اور آئی ایس آئی کے ذمہ دار حضرات کے بارے میں گذشتہ سالوں بلکہ مہینوں تک میں جو کچھ آتا رہا ہے' اس پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایم کیو ایم نے اپنے اس نظریاتی موقف کے ساتھ کہ:

ہندستان کی تقسیم انسانیت کی تاریخ کی عظیم ترین غلطی تھی

نام لے کر فوج اور اس کے اداروں کو اپنا دشمن قرار دیا ہے اور فوج اور پولیس کے ۴۸ اعلیٰ افسروں کو "most wanted people" (انتہائی مطلوب مجرم) قرار دیا۔ اس فہرست میں آئی ایس آئی' آئی بی اور ایف آئی اے کے نام سب سے اُوپر تھے۔ ان ناموں میں لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی' لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر' لیفٹیننٹ جنرل اسعد درانی' میجر جنرل

نصیراللہ بابر' کرنل عبید اور خفیہ ایجنسیوں کے طارق لودھی' مسعود شریف اور رحمان ملک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس آئی ایس آئی کے ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کو آج پھول پہنائے جارہے ہیں اس آئی ایس آئی کے بارے میں ان کی ویب سائٹ کا فتویٰ یہ ہے:

> آئی ایس آئی بدنام زمانہ ہے۔ اسے ریاست در ریاست قرار دیا جاتا ہے یا پاکستان کی نہ دکھائی دینے والی حکومت۔ اس نے بھارتی کشمیر میں مسلمان باغیوں کو اسپانسر کیا ہے' اور طالبان کو کھڑا کیا ہے اور افغانستان میں اس کے پسندیدہ مگر شرپسند عرب مہمانوں کی سرپرستی کی ہے--- (گو یہ خود ان الزامات کی تردید کرتی ہے)۔ اس کے پنجے پاکستانی سیاست' عدالت اور روزمرہ زندگی تک گڑے ہوئے ہیں۔ سب اس سے ڈرتے ہیں۔ کسی آئی ایس آئی افسر کی ایک زہریلی سرگوشی کسی کے کیریر کے تباہ کرنے' گرفتار کرنے یا اس سے بھی بدتر انجام تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔

ایم کیو ایم کو مبارک ہو کہ اس ''زہریلی سرگوشی'' سے اب وہ گورنری اور وزارتوں پر متمکن ہے اور ''تھا جو ناخوب'' وہ خوب بلکہ خوب تر ہوگیا۔

ایم کیو ایم' جس کے بارے میں واقفانِ حال جانتے ہیں کہ اس کا قیام بھی اسی ''سرگوشی'' کا رہینِ منت ہے' اور اس کی خون آشام جولانیاں بھی اس کی سرپرستی اور حفاظتی چھتری میں کراچی اور حیدرآباد کو خون کی ہولی کھلاتی رہی ہیں اور پھر اس کا دور ابتلا بھی انھی سرپرستوں کو آنکھیں دکھانے کی پیداوار تھا اور اب اس کا نیا ہنی مون بھی انھی کی کرشمہ سازی ہے--- یہ سب بجا' لیکن کیا یہ سب قوم اور تمام سیاسی جماعتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں! کیا ایجنسیوں کا ہماری زندگی میں اس طرح دخیل ہونا اور کھل کھیلنا گوارا کیا جاسکتا ہے؟ کیا حاضر سروس فوجی اور سول حکام کو اسی طرح سیاسی جوڑتوڑ اور بناؤ بگاڑ کی کارفرمائی کی چھوٹ ملی رہنا چاہیے؟ کیا وقت نہیں آگیا کہ سب مل کر ''بس بہت ہو چکا'' (enough is enough) کہہ دیں تاکہ سول نظام فی الحقیقت سول اور جمہوری نظام کی صورت اختیار کرسکے۔

یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہی نہیں' فیصلہ کن وارننگ بھی ہے:

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

سگریٹ نوشی ---خودسوزی ہی نہیں خودکشی!

ورلڈ بنک کی ایک تازہ رپورٹ میں جو ۱۹۹۹ء کے حالات کے جائزے پر مشتمل ہے یہ وحشت ناک حقائق دنیا کے سامنے پیش کیے گئے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں ۱۹۹۹ء میں ۱۷۵ ارب سگریٹ کام و دہن کو دھواں دار کرنے کا باعث ہوئے لیکن پاکستان، اس علاقے کی آبادی کا صرف دس فی صد ہونے کے باوجود، سگریٹ نوشی میں ۳۲ فی صد حصہ بٹانے والا ملک ہے۔ (دی ڈیلی ٹائمز، ۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء)۔ ۱۵ سال کی عمر سے بڑے افراد کا تناسب اگر نکالا جائے تو اگرچہ علاقے کا اوسط ۱۰ پیک فی کس ہے لیکن پاکستان میں ۳۰ پیک فی کس سے متجاوز ہے۔ تپ دق اور سرطان جیسے موذی مرض اس کا عطیہ ہیں۔ پورے علاقے میں سگریٹ سے پیدا ہونے والے امراض میں ہر سال خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ مردوں میں اس کا استعمال اور سگریٹ نوشی پر مبنی امراض سے اموات کا تناسب عورتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ سگریٹ نوشی کے فروغ میں سب سے اہم کردار سگریٹ کے اشتہارات کا ہے۔ بھارت نے ان پر مکمل پابندی عائد کر دی ہے لیکن پاکستان میں اس کی کوئی فکر نہیں۔ اور ذرا سی آمدنی (ریونیو) کے لیے سگریٹ سے خودسوزی کی بلا کو پروان چڑھایا جارہا ہے جو قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ پاکستان ٹوبیکو کمپنی نے اپنے طور پر اشتہارات پر کچھ پابندیاں عائد کر کے اچھا اقدام کیا ہے مگر اسے بھی پبلسٹی کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ ملک کی نئی جمہوری حکومت کو خودسوزی کے اس عمل کو لگام دینے کے لیے جلد موثر تدابیر اختیار کرنا چاہییں۔

انسانی رویے

ابومسعود اظہر ندوی

انسانی وجود کے کئی پہلو ہیں۔ وہ محض ایک بے جان مشین نہیں بلکہ روح بھی رکھتا ہے اور جسم بھی، عقل بھی رکھتا ہے اور احساس و جذبات بھی۔ ان میں سے ہر پہلو کے کچھ مخصوص تقاضے ہیں جن کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اب اگر کسی ایک پہلو ہی پر نظر رکھی جائے اور دوسرے پہلو کو یکسر نظرانداز کر دیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی، مثلاً ایک کارخانے دار اپنے کارکنوں کے جسموں ہی پر توجہ دیتا ہے کہ وہ کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں اور کتنی پیداوار ان سے حاصل ہوتی ہے اور ان کے احساسات و جذبات کو نظرانداز کر دیتا ہے، تو آخرکار کارکنوں کی معنوی پژمردگی کارخانے کی پیداوار پر بھی اثرانداز ہوکر رہتی ہے۔

آپ ایک شخص سے بات کرتے ہیں۔ آپ کا اندازِ گفتگو اس کے دل میں آپ کے لیے احترام وقدر بھی پیدا کرسکتا ہے اور بے قدری و بیزاری بھی۔ آپ کسی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، آپ کے اندازِ بیان سے محسوس ہو جاتا ہے کہ آپ دل سے شکریہ ادا کر رہے ہیں یا یہ محض ایک تصنع اور بناوٹ ہے اور آپ صرف زبانی خانہ پُری کر رہے ہیں۔ ایک شخص آپ سے کوئی بات کہتا ہے، آپ پوری توجہ سے سنتے ہیں یا محض ہوں ہاں کر کے اسے ٹال دیتے ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی مختلف چیزیں آپ کے مخاطب کو آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں کہ آپ ایک بامقصد و بامعنی بات کرتے ہیں یا بے مقصد اور لایعنی بات کرنے والے ہیں۔ اس لیے طرزِ گفتگو میں شائستگی اور آداب کا لحاظ رکھنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔

انسانی رویے کے محرکات

انسانی سلوک و معاملت کے پس پشت عوامل ومحرکات کا دارومدار دراصل انسان کے عقیدے اور نظریۂ زندگی پر ہوتا ہے۔ ایک غیرمومن شخص سچ بولتا ہے، خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے، وعدہ کا پابند ہے اور اسی طرح دیگر امور میں بھی خوش گوار طرزِعمل اپناتا ہے تو اس کا محرک ذاتی شرافت، مصلحت اور کسی نفع کی امید یا نقصان کا خوف بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص چوری نہیں کرتا لیکن اس کی وجہ نگرانی اور پکڑے جانے کا خوف بھی ہوسکتا ہے۔ اگر یہ مصلحت یا خوف باقی نہ رہے، تو وہ شخص اپنے حقیقی رنگ میں آجاتا ہے۔ آج بہت سے لوگ امریکہ اور یورپ کی دیانت داری کا ذکر ستایش کے ساتھ کرتے نہیں تھکتے لیکن اسی امریکہ کے ایک شہر میں آٹھ گھنٹوں کے لیے بجلی چلی جاتی ہے--- اور یہ بہت مشہور واقعہ ہے--- تو اس مختصر وقفے میں چوری کی ۵ ہزار وارداتیں درج کرائی جاتی ہیں کیونکہ بجلی چلے جانے کی وجہ سے کیمروں نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور لوگوں کو پکڑے جانے کا ڈر نہیں رہ گیا تھا۔

لیکن ایک مومن کے محرکات وعوامل اس سے مختلف ہوتے ہیں۔

مومن کو اللہ کا نیک بندہ اور شریف انسان بننے کی ہدایت کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ بندگانِ خدا کے ساتھ حسن سلوک دراصل اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو سب سے اچھے اخلاق کا حامل ہو''۔ بہترین اخلاق پر مومن اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب کا امیدوار رہتا ہے۔ خوش اخلاقی کا مظاہرہ اس کی ذاتی مصلحت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقصدِ زندگی کا عین تقاضا ہوتا ہے، چاہے لوگ خوش ہوں یا ناراض، تعلقات خوش گوار ہوں یا ناخوش گوار، محبت و اعتماد حاصل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، وہ بہرصورت اپنے رب کو خوش رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ یہی اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ اس سے بہترین اخلاق پر برابر قائم رہنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''انسان اپنے اچھے اخلاق کی بدولت مستقل طور پر رات کو نمازیں پڑھنے والے اور دن میں روزے رکھنے والے شخص کے درجات حاصل کر لیتا ہے''۔

خوش اخلاقی مومن کی بہترین صفات میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے

ہیں: ''مومن (دوسروں سے) مانوس ہوتا بھی ہے اور انھیں مانوس کرتا بھی ہے۔ اور جو ایسا نہ کرے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ لوگوں میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔ (جامع صغیر)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح بہترین اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ہم اللہ کے راستے کی طرف بھی لوگوں کو حکمت اور بہترین خیرخواہی کے ساتھ دعوت دیں۔

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ (النحل ۱۶:۱۲۵) اے نبیؐ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو' حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا تو سب سے اچھی بات ہے ہی' بلانے کے لیے انداز بھی حکیمانہ اور دل کو موہ لینے والا اختیار کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے خود رسولؐ اللہ کی صفت نرم دلی بتائی ہے جو انسان کو خوش گوار سلوک کا پیکر بناتی ہے۔ فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَہُمۡ ۚ وَلَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَا نۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ (آل عمران ۳:۱۵۹) ''یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم دل واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے''۔

بہترین سلوک کی ایک شکل غلطیوں سے درگزر کرنا بھی ہے۔ یہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کا باعث بھی ہوتا ہے۔ کسی قدیم دانش ور کا قول ہے کہ لوگوں کے ساتھ محبت آمیز برتاؤ کرنا نصف عقل ہے۔

اگر اخلاق کی پشت پر کارفرما عوامل بہترین اور پسندیدہ نہیں ہوتے تو ان کی بنیاد نہایت کمزور اور ناپایدار ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے اثرات بھی وقتی اور ناپایدار ہوتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ماتحت اپنے افسر کے ساتھ بظاہر بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں' اس کی خوشی وغم میں شریک ہوتے ہیں لیکن اس کے ریٹائر ہوجانے پر اس سے کوئی ربط و تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ اگر تعلق کی بنیاد خلوص اور بے غرضی ہوتی' تو ربط و تعلق کا یکسر خاتمہ نہ ہوجاتا۔

جس طرح اچھے اخلاق کی بنیاد خدا ترسی اور اس کی رضا کا حصول ہے، اسی طرح اس کے کچھ ضابطے اور احکام بھی ہیں جو ہمارے اپنے مقرر کردہ نہیں بلکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں۔ جس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ حرام اور قابل اجتناب ہے اور جس چیز کو لازم قرار دیا گیا ہے اسے چھوڑنے کی کوئی گنجایش نہیں۔ مثلاً والدین کے ساتھ حسن سلوک اور رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی طرح جن امور کی نشان دہی رسولؐ اللہ نے فرمائی ہے ان میں بھی کسی چوں چرا کی گنجایش نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے لیے ان میں سراسر بھلائی ہی بھلائی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سے واقف ہونے کی ہم مسلسل اور سنجیدہ کوشش کرتے رہیں اور جس حد تک واقفیت ہو، ان پر عمل پیرا ہوں۔

طرزِ سلوک

لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاملہ کے کچھ فطری اصول وقواعد ہیں جو ساری دنیا میں اور تمام قوموں میں تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن انھیں تسلیم کرنے اور ماننے کا فائدہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ہماری زندگی مخلصانہ طور پر ان ہی اصولوں پر استوار ہو اور حالات کی نرمی وسختی ہماری راہ میں حائل نہ ہوسکے۔

نارمل لوگوں کے ساتھ تو اکثر ان ہی قواعد کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کے ساتھ اگر حسنِ سلوک، عزت اور احسان کا معاملہ کیا جاتا ہے تو دل میں قدر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نارمل نہیں ہے، تو اس سے معاملہ کرتے وقت اس کے مزاج وطبیعت کا لحاظ رکھا جائے۔

اپنے علم و ادراک اور فہم وشعور کے اعتبار سے بھی لوگوں کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک انسان ذہین اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ دوسرا کم عقل اور کم فہم ہوتا ہے، اس کا علم بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کی ذہانت اور صلاحیت کے مطابق ہی ان سے گفتگو کی جائے۔ یہی نصیحت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس قول سے بھی ملتی ہے کہ ''تم لوگوں سے اگر کوئی ایسی بات کروگے جو ان کے ذہن سے بلند تر ہو تو وہ بات ان کے لیے فتنہ بن جائے گی''

(مسلم)۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ یا تو اس بات کو سمجھ ہی نہیں پائیں گے یا غلط سمجھ بیٹھیں گے۔

لوگ کیا پسند کرتے ھیں

یہ ایک فطری بات ہے کہ لوگ اس شخص کو پسند کرتے ہیں جو ان میں ذاتی طور پر بھی دل چسپی لیتا ہو' ان کے خیالات و مسائل پر بھی توجہ دیتا ہو' جو ان کی ضروریات پوری کرتا ہو اور انھیں تحفے تحائف سے بھی نوازتا ہو۔ حدیث میں آتا ہے: ''باہم تحفے دیا کرو' اس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے'' (مؤطا)۔ تحفہ چاہے معمولی قیمت ہی کا کیوں نہ ہو' اس سے توجہ اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ کھانے کی دعوت بھی لوگوں کے درمیان قربت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اگرچہ کسی شخص کو کسی کام کے کرنے یا اس سے باز رہنے کا مشورہ دینا بھی نیکی ہے' لیکن بہت سے لوگوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ آپ جس چیز کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں' حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق کے ذریعے دیں' اس سے بھی دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو اور سب سے زیادہ پسندیدہ عمل یہ ہے کہ آپ کسی مسلمان کو خوش کر دیں' یا اس کی کوئی پریشانی دُور کر دیں' یا اس کا کوئی قرض ادا کر دیں' یا اس کی بھوک مٹا دیں۔ اگر آپ اپنے بھائی کے ساتھ اس کی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے جائیں تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ آپ ایک مہینے تک مسجد میں اعتکاف کیے رہیں''۔

اگر ذمے داران اور ملازمین یہ سمجھ لیں کہ لوگوں کے معاملات جلد نمٹانا' بلاتاخیر ان کی ضرورت پوری کرنا بھی حسنِ سلوک سے تعلق رکھتا ہے اور باعث اجر ہے' تو وہ جلد جلد معاملات کو نمٹانے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر لوگ ٹھیک طور سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے لگیں تو معاشرہ مثالی بن جائے اور ہم مغربی ممالک کی مثالیں نہ دیں۔

فرانس میں ایک بار ایسا ہوا کہ کارخانوں کے ملازمین نے ہڑتال کر دی' لیکن کچھ

ملازمین ہڑتال میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے افسران اور ذمّے داران ان سے ذاتی روابط رکھتے تھے' مسائل حل کرنے میں ان کی مدد کرتے تھے اور انھیں مشینوں کے بجائے باعزت انسان قرار دیتے تھے۔ جن کارخانوں اور دفتروں میں ملازمین کے ساتھ ذمّے دار حضرات ہمدردی و انسانیت کا سلوک کرتے ہیں وہاں ملازمین بھی خوش دلی کے ساتھ ان کا حکم مانتے اور اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کارخانوں کی پیداوار بھی بڑھ جاتی ہے۔

لوگوں کو یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی ان کی باتیں توجہ سے سنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ یہ نہیں کہ ہمیشہ اپنی ہی باتیں سناتا رہے۔ اگر آپ اچھی گفتگو کرنے والے بننا چاہتے ہیں تو پہلے اچھے سننے والے بنیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں آپؐ صحابہ کرامؓ کی ضرورتوں سے واقف ہو کر ان کے ذاتی مسائل میں دل چسپی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دُکھ سکھ' ملازمت کے لیے تقرری' ترقی اور شادی وغمی وغیرہ سے متعلق لوگوں کے ذاتی مسائل میں دل چسپی لینا اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویّہ اختیار کرنا محبت و یگانگت کا باعث ہوتا ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ گفتگو میں بے مقصد تکرار اور بحث ومباحثہ پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ دوسرے کی عزت کریں گے تو وہ آپ کی عزت کرے گا۔ انسان کے اندر چھپے ہوئے پاکیزہ جذبات کو اُبھارنا چاہیے اور اس پہلو کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کسی کو بھی اپنے مقابلے میں کم تر سمجھنا اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھنا انسانیت وشرافت کا نہیں' شیطنت اور کمینگی کا خاصہ ہے۔ اپنے عیوب اور خامیوں پر اور دوسرے کی خوبیوں پر نظر رکھنا حقیقی انسانی شخصیت کے ارتقا کا باعث ہوتا ہے۔ اپنے سے چھوٹے منصب یا عمر والوں کی بھی عزت کرنی چاہیے اور ان سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔

جن لوگوں سے آپ کو سابقہ پڑتا ہے انھیں مناسب مواقع فراہم کر کے ان میں خود اعتمادی پیدا کیجیے۔ کسی کی صلاحیتوں کو نظرانداز کرنا اس کے اندر دل شکستگی اور بیزاری پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ مومن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کام کرتا ہے' تاہم انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ

قدر دانی اور حوصلہ افزائی کو پسند کرتا ہے۔

ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے انسانوں کا شکریہ نہیں ادا کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر بھی نہیں کیا''۔ کسی کے حق میں کلمۂ خیر کہنا اور اسے دُعا دینا بھی حوصلہ افزائی کا ایک بڑا ذریعہ ہے جس سے مزید اچھے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہاں، کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔

یہ بھی ایک بہت اہم اور پسندیدہ بات ہے کہ لوگوں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے ان کی غلطیوں اور خامیوں کی حکمت و دانائی سے اصلاح کی جائے اور مثبت پہلو اُبھارا جائے۔ مثلاً ایک صاحب علم شخص آپ سے مشورہ کرتا ہے کہ وہ تجارت کرنا چاہتا ہے۔ آپ اس کے اندر نہ اس کا ذوق پاتے ہیں اور نہ اس کی صلاحیت، تو آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک صاحبِ قلم و صاحبِ فکر شخص ہیں، اس میدان کو نہ چھوڑیے۔ اس کے بجائے اگر آپ نے کچھ ایسی بات کہہ دی کہ وہ کوئی کاروباری صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو عین ممکن ہے کہ آپ کی بات اسے ناگوار ہو۔

یہ بات بھی لوگوں کو اچھی لگتی ہے کہ انھیں اچھے ناموں سے پکارا جائے، تحقیر آمیز انداز نہ اختیار کیا جائے۔

لوگ کیا ناپسند کرتے ھیں

اس میں اختلاف رائے نہیں ہوسکتا کہ لوگ برسرِ عام نصیحت کو ناپسند کرتے ہیں اور ہرگز نہیں چاہتے کہ ان کے عیب اور برائیاں لوگوں کے سامنے بیان کی جائیں۔ اگر کسی شخص کو نصیحت کرنا چاہتے ہیں تو تنہائی میں کیجیے۔ اس طرح وہ شخص نصیحت قبول کرنے کی طرف زیادہ مائل ہوگا اور اس کے دل میں آپ کی قدر اور احسان شناسی کا جذبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی نصیحت سے انسان فوراً مکمل طور پر بدل جائے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نصیحت کو سمجھنے، قبول کرنے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کے لیے

انسانی مزاج کو وقت درکار رہتا ہے۔

انسان براہِ راست نکتہ چینی پسند نہیں کرتا۔ اسے یہ بھی گراں گزرتا ہے کہ اس سے حکم کے انداز میں کہا جائے کہ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ اگر وہی بات مناسب موقع پر اور حکمت کے ساتھ کہی جائے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ زیادہ قابل قبول ہوگی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکمت و نرمی والا اسلوب اختیار فرماتے تھے۔ مثلاً کچھ خستہ حال لوگ آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ ان کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئے اور مسجد میں ان کی مدد پر اُبھارنے کے لیے لوگوں کے سامنے تقریر فرمائی۔ لیکن بجائے براہِ راست حکم دینے کے آپؐ نے ماضی کے واقعے کے طور پر ذکر فرمایا کہ کسی نے دینار و درہم صدقہ کیا، کسی نے کپڑے اور کسی نے کھجور۔ اس کے بعد ایک انصاری کافی کھجور لاد کر لائے۔ بوجھ سے ان کے پیر کانپ رہے تھے۔ آپؐ کا چہرہ کھل گیا۔ دوسرے لوگ بھی لا لا کر آپؐ کے پاس ڈھیر کرتے رہے۔ آپؐ نے خوش ہو کر فرمایا: ''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا اسے وہ طریقہ اختیار کرنے والوں کے برابر ثواب ہمیشہ ملتا رہے گا''۔ (مسلم)

غور کیجیے آپؐ نے کس حکمت کے ساتھ لوگوں کو صدقہ کرنے پر اُبھارا اور پھر کس طرح صدقہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

ایک استاد اپنی میز کلاس روم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ طلبہ بھی اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اب اگر وہ کہتا ہے کہ آؤ یہ میز اُٹھا کر وہاں رکھ دیں، یا اس طرح کہتا ہے کہ اگر یہ میز اُٹھا کر وہاں رکھ دی جائے تو تم لوگوں کے خیال میں کیسا رہے گا؟ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی نکلے گا، لیکن دوسری صورت طلبہ کے لیے زیادہ پسندیدہ ہوگی۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ جو کام کرانا چاہتے ہیں اس کی اہمیت مخاطب کے دل میں پیدا کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ لوگوں کو جو حکم دینے والے ہوتے پہلے اس کے بارے میں شوق پیدا کر دیتے، مثلاً غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک دن آپؐ نے فرمایا: ''کل میں جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کو محبت ہے'' (متفق علیہ)۔ ہر شخص تمنا کرنے لگا کہ کاش وہ شخص میں ہی ہو جاؤں، یا مثلاً آپؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو امارت سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''میں تمھارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو خود

اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ کبھی دو آدمیوں کے بھی امیر مت بننا‘‘۔ (مسلم)

ایک شخص چند مہمانوں کو کھانے پر مدعو کرتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی اہلیہ کو براہِ راست حکم دیتا ہے کہ فلاں فلاں چیز پکالو۔ پھر بعد میں نکتہ چینی کرتا ہے کہ فلاں چیز کیوں بھول گئیں تو اس انداز میں، اور اس طریقے میں زمین آسمان کا فرق ہو جائے گا کہ وہ اپنی اہلیہ سے کہے کہ آج فلاں وقت کچھ مہمان آنے والے ہیں اور کھانے سے گھر والوں کے ذوق و معیار کا پتا چلتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگوں کا سر نیچا نہ ہونے پائے۔ ایسی صورت میں اہلیہ زیادہ خوش دلی اور توجہ سے کام کرے گی۔

لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ ان کے عیبوں اور خامیوں کو تو تلاش کیا جائے اور ان کی اچھائیوں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ’’کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی بات اسے ناپسند ہے تو کوئی دوسری بات پسند بھی ہوسکتی ہے‘‘۔ (مسلم)

کوئی شخص بھی خامیوں سے مبرا نہیں۔ اور نہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک شخص میں خامیاں ہی خامیاں ہوں اور خوبی کوئی نہ ہو۔ ایسے شخص کی تلاش جس میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، کوئی بھی خامی نہ ہو، محض خیالی بات ہوگی۔ ہم بعض لوگوں کی کچھ چیزیں ناپسند کرتے ہیں لیکن جب وہ ہم سے دُور ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ ان سے بدتر ثابت ہوتے ہیں تب پہلے لوگوں کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ منفی ہے۔ اس کی بنیاد لوگوں کی برائیوں ہی پر نظر رکھنے پر ہوتی ہے۔ اس میں غلطیاں اصلاح کی خاطر نہیں دیکھی جاتیں بلکہ خود غرضی اور لوگوں کے استحصال کا جذبہ اس کا محرک ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ مثبت ہے اور وہ یہ کہ آپ لوگوں کی خوبیوں پر توجہ دیں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے اسی طریقے کی نشان دہی فرماتے ہیں: ’’میں تمھیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، کیونکہ یہ لوگ میرے خاص الخاص ہیں۔ انھوں نے اپنا حق ادا کر دیا (یعنی بیعت عقبہ میں جو عہد کیا تھا وہ پورا کر دیا)۔ اب ان کے حق کی ادایگی باقی رہ

گئی ہے۔ لہٰذا ان میں سے جو اچھا کرے اسے قبول کرو اور جو کوئی غلطی کر جائے اس سے درگزر کرو''۔(بخاری)

لوگ ایسے اشخاص کو ناپسند کرتے ہیں جو ان کی غلطیوں کو بھولتے نہیں بلکہ یاد رکھتے ہیں اور موقع بہ موقع یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو معاف کر دیتے ہیں تو اس پر احسان جتاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے کردار کو سراہا ہے جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں' ان کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ آپ جس کے ساتھ کوئی بھلائی کریں گے تو یہ عین متوقع ہے کہ وہ اس بھلائی کو نہیں بھولے گا لیکن احسان جتانے سے تو بھلائی تلخی میں بدل جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا''۔(مسلم)

اور یہ تو نہایت معیوب بات ہے کہ لوگوں کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ کیا جائے اور ان پر اپنی بڑائی جتائی جائے۔ اس کے بجائے انکسار و تواضع پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا ایک واقعہ ان کے ایک شاگرد نے بیان کیا ہے کہ امام صاحب ایک رات میرے گھر آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا' میں نکلا تو سلام کلام کے بعد فرمایا' آج میرے دل میں ایک چیز بار بار کھٹکتی رہی۔ میں دن میں گزرا تو آپ لوگوں سے حدیث بیان کر رہے تھے۔ آپ سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ دھوپ میں کاغذ قلم لے کر لکھ رہے تھے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ سب لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھنا چاہیے۔ دیکھیے امام صاحب نے تنہائی میں کس خوب صورتی کے ساتھ نصیحت کی۔ اور یہ واقعہ بیان کرنے والے بھی ان کے وہی شاگرد ہیں۔ خود امام صاحب نے کسی سے بیان نہیں کیا۔ اپنے کسی ساتھی کو بھی سب کے سامنے ٹوکنا پسندیدہ نہیں ہے۔

دوستوں کو جلد جلد ملاقات نہ کرنے پر بھی ملامت نہیں کرنی چاہیے۔ دراصل محبت کا تقاضا بار بار کی ملاقات سے پورا نہیں ہوتا۔ کتنے دوست ایسے ہوتے ہیں جن سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہو پاتی ہے لیکن ان کی محبت پختہ اور مخلصانہ ہوتی ہے۔

لوگ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص اپنی غلطی پر مصر رہے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کی تلافی کی کوشش کرنی چاہیے۔ غلطی سے محفوظ رہنے کی ایک اہم تدبیر یہ بھی ہے کہ جس چیز کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہوں' اس کے بارے میں اظہار رائے کرنے سے احتراز کیا جائے۔ کسی چیز کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

انسان کی یہ خصلت بھی بدذوقی کی علامت ہوتی ہے اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کہ وہ ہر کامیابی کو اپنی طرف منسوب کرے اور غلطیاں اور ناکامیاں دوسروں کے سر ڈالے۔

مومن کا طرزِ عمل

جب بندہ اپنے پروردگار پر سچا ایمان رکھے گا اور آخرت کے محاسبے پر اور اس بات پر اسے پورا یقین ہوگا کہ ہر ایک نیکی اور بدی کا اسے بدلہ ضرور ملے گا تو اس کا یہ یقین اسے اس امر کا مستحق بنائے گا کہ اللہ کی ہدایت اسے سیدھی راہ اختیار کیے رہنے کا موقع عنایت کرے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرے گا' اس کی نافرمانی سے بچے گا' لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے گا۔ دیانت دار و امانت دار بن کر رہنے کی کوشش کرے گا۔ ایفائے عہد کرے گا' نیکی اور خداترسی کے کاموں میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرے گا' صداقت شعار ہوگا' اس کے لینے اور دینے کے پیمانے ایک ہوں گے اور اپنی پوری زندگی کو اسی اصول پر استوار کرنے کی کوشش کرے گا۔ اَوْفُوْا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (الشعرا ۲۶:۱۸۱-۱۸۲) ''پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو' صحیح ترازو سے تولو''۔ وہ خرید و فروخت میں کشادہ دلی سے کام لے گا۔ دوسروں پر اپنے حقوق کے تعلق سے نرمی اختیار کرے گا' کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''جس نے ہمیں دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں''۔ سامانِ تجارت کی قیمت بڑھا چڑھا کر نہیں بتائے گا' نہ جھوٹی قسمیں کھائے گا۔ وہ قیمتیں بڑھانے کے لیے ذخیرہ اندوزی بھی نہیں کرے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''جس نے غذائی اشیا ۴۰ دن تک روکے رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہوگیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے دُور ہوگیا'' (احمد و حاکم)۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کو پیش

نظر رکھے گا کہ سچا دیانت دار تاجر نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔

اگر وہ کسان ہے تو زمین سے غلّہ وغیرہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے مقصد سے اس پر پوری توجہ دے گا کیونکہ پیداوار کے ساتھ اسے اجر وثواب بھی ملے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ''جو مسلمان بھی کوئی پودا لگاتا ہے یا کوئی کھیت بوتا ہے۔ اس سے انسان، پرندے اور جانور جو بھی کھاتے ہیں اسے اس کا ثواب ملتا ہے''۔

وہ لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو پسند ہو۔ پڑوسیوں کے کھیتوں کی بھی حفاظت کرے گا۔ بغیر اجازت ان میں داخل نہیں ہوگا اور نہ کوئی نقصان پہنچائے گا۔ کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو کترائے گا نہیں۔ بیج اور زرعی آلات کی ضرورت ہو تو وہ بھی دے گا اور اپنے مفید تجربات سے بھی انھیں فائدہ پہنچائے گا۔ کسی کی برائی نہیں کرے گا، نہ کسی سے حسد کرے گا۔ اگر وہ کوئی ہنرمند ہے تو یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ کسی اچھے کام کا اجر ضائع نہیں ہونے دیتا اور یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ جب کوئی شخص کوئی کام کرے تو اسے اچھی طرح کرے'' (بخاری)۔ اپنے ہنر کے مطابق بہترین کام کرنے کی کوشش کرے گا۔ لوگوں سے جو وعدہ کرے گا اسے پورا کرے گا۔ وقت پر کام پورا کر کے دے گا۔ کسی طرح کی فریب کاری نہیں کرے گا۔ اس طرح اس کی شہرت بھی بڑھے گی اور اس کی آمدنی بھی۔ ساتھ ہی وہ قوم و وطن کی خدمت کر کے دنیا و آخرت کی سعادت بھی حاصل کرے گا۔

اگر وہ ایک معلم و استاد ہے تو اپنے فرائض کی اہمیت محسوس کرے گا اور یہ سمجھے گا کہ طلبہ کی اصلاح کا دارومدار خود اس کی اصلاح پر ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو رہنما بنائے گا کہ ''میں تم لوگوں کے لیے ویسا ہی ہوں جیسا باپ اپنے بیٹوں کے لیے ہوتا ہے''۔ وہ طلبہ سے نرمی و محبت کا برتاؤ کرے گا، ان پر سختی نہیں کرے گا۔ اپنے شریفانہ سلوک و اخلاق سے ان کی عملی تربیت کرے گا۔ ان کی تعلیمی ترقی اور کامیابی کے لیے پوری کوشش کرے گا۔ انھیں بلند ہمتی اور محنت سکھائے گا۔ ساتھ ہی وہ طلبہ کی ذہنی سطح کا لحاظ بھی کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہم انبیا کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم لوگوں سے ان کے مرتبہ و مقام کے مطابق برتاؤ کریں اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہی ان سے گفتگو کریں''۔ اچھا استاد

اپنے شاگردوں کو اپنا پورا علم سکھانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''جس نے کوئی مفید علم چھپایا وہ قیامت کے دن آگ کی لگام لگائے ہوئے پیش ہوگا''۔ پھر اپنے علم کے مطابق عملی نمونہ بھی پیش کرے گا۔ تاکہ لوگوں پر علم کا فائدہ ظاہر ہو سکے اور وہ بھی علم سیکھنے کی کوشش کریں ورنہ لوگ اس کے علم کو بیکار سمجھ کر اس سے بے نیازی اختیار کریں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ ''جب عالم اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا تو جاہل علم سیکھنے ہی سے رُک جاتا ہے''۔

اگر وہ شاگرد طالب علم ہے تو اپنے استاد کی عزت کرے گا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے کسی درباری سے پوچھا: آج کے دور میں سب سے زیادہ معزز شخص کون ہے؟ اس نے جواب دیا: ہم تو امیرالمومنین (ہارون رشید) سے زیادہ کسی کو معزز نہیں جانتے۔ خلیفہ نے کہا: نہیں، کسائی مجھ سے زیادہ معزز ہیں، میں نے امین اور مامون (شاہزادوں) کو ان کے جوتے اُٹھانے کے لیے دوڑتے دیکھا ہے۔

غرضیکہ ہر طرح کے حالات اور اپنی ہر ایک حیثیت میں آئین وضوابط اور پاکیزہ روایات کا پابند ہو کر رہنے کی کوشش کرے گا۔

نیکی کرنا ذمّے داری ہے

خود بھی نیکی کرنا ایک انسانی ذمّے داری ہے اور دوسروں کو نیکی کرنے پر آمادہ کرنا بھی نہایت پسندیدہ کام ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی بھلائی کی طرف رہنمائی کی اسے (وہ بھلائی) کرنے والے جیسا ہی اجر ملے گا''۔ (مسلم)

یعنی جس نے کسی دینی یا دنیاوی بھلائی کی طرف کسی شخص کی رہنمائی کی یا اسے آمادہ کیا، اسے بھی بھلائی کرنے والے کے برابر ثواب ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے بہتر نیکی لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانا ہے۔ اسی طرح لوگوں کی کسی قسم کی مدد کرنا،

انھیں سہارا دینا' ضرورت مند کی دادرسی کرنا' معذور کی مدد کرنا' قرض دینا' کوئی چیز مستعار دینا' تحفہ دینا وغیرہ اچھی بات ہے۔

مسند احمد میں حضرت ابوجری جہنیؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: کسی بھی نیکی کو حقیر و کم تر نہ سمجھو' چاہے کسی کو رسّی کا ایک ٹکڑا ہی دیا ہو یا جوتے کی کیل ہی دی ہو یا کسی کے برتن میں پانی ہی ڈالا ہو یا راستے سے کوئی تکلیف دہ چیز ہی ہٹائی ہو یا اپنے بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملے ہی ہو یا ملنے پر اپنے بھائی کو سلام ہی کیا ہو وغیرہ۔

ابن حبان میں حضرت ابوذرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے بہت سے کام گنانے کے بعد فرمایا کہ اگر کچھ بھی نہ ہو سکے تو لوگوں کو ایذا رسانی ہی سے محفوظ کر دے۔

مسلمان بھائی کے حقوق ادا کرنا بھی نیکیوں میں شامل ہے جیسے مریض کی عیادت کرنا' مظلوم کی مدد کرنا' سلام کرنا' دعوت قبول کرنا' جنازے میں شریک ہونا وغیرہ۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں: جو اپنے بھائی کے کسی کام سے جائے تو اس کا ہر قدم نیکی ہے۔ اسی طرح کسی تنگ دست پر قرض ہو تو اسے ڈھیل دیتے رہنا بھی نیکی ہے' حتیٰ کہ جانوروں سے اچھا برتاؤ کرنا بھی نیکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: فی کل کبد رطبة اجر ''ہر جان رکھنے والے جگر میں اجر ہے''۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ایک زانی عورت نے پیاس سے تڑپتی ہوئی ایک بلی کو پانی پلا دیا تھا اس کی بخشش اسی بات پر کر دی گئی۔

جو مسلمان بھی کوئی درخت لگائے گا تو اس میں سے جو کھایا جائے گا وہ اس کا صدقہ ہوگا' جو اس میں سے چرا لیا جائے گا وہ اس کا صدقہ ہوگا' جو جانور یا پرندے کھالیں گے وہ اس کا صدقہ ہوگا اور اس میں جو بھی کم ہوگا وہ اس کا صدقہ ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کا صدقہ قیامت تک کے لیے ہوگا۔

تاریخ بخاری میں حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: جس نے کوئی کنواں کھودا تو انسانوں' جنوں' جانوروں اور پرندوں میں سے جو بھی پیاسا پیے گا اس کا ثواب اسے قیامت تک ملتا رہے گا۔

ایک دوسری روایت میں عمارت بنانے کے سلسلے میں بھی ایسا ہی قول منقول ہے۔ اس طرح کے کام اسی لیے صدقہ جاریہ کہلاتے ہیں۔ الغرض معاشرے کو صحت مند اور خوش گوار بنانے کے لیے حتی المقدور اچھے کام کرتے رہنا انسان کی ذمّے داری ہے اور یہی مثبت اور تعمیری طرزِ عمل ہے جس سے معاشرہ امن و سکون اور محبت و یگانگت کا گہوارا بنتا ہے۔

سماجی خدمات

یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اس لیے خدمتِ خلق یا بالفاظِ دیگر سماجی خدمات کی نہایت اہمیت ہے۔ ان کے ذریعے انسان نہ صرف اپنے معاشرے کی خدمت کرتا ہے بلکہ وہ پورا ماحول سازگار بناتا ہے جس میں خود اسے زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ دنیا کی دیگر قوموں نے سماجی خدمات میں حصہ لینا اپنی زندگی کا ایک اہم جز بنا رکھا ہے۔ تعلیمی اداروں' یتیم خانوں' بے سہارا لوگوں کے لیے پناہ گاہوں اور بیماروں کے لیے ہسپتالوں وغیرہ کا جال پھیلا کر وہ اپنے معاشرے کے دکھ درد کو بانٹنے کی کوشش بھی کرتی ہیں اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی راحت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ یہ بھی انسانی سلوک کا ایک لازمی جز ہے کہ انسان حیوانوں کی سطح سے اُوپر اُٹھ کر دوسرے بھائیوں کی ہمدردی اور راحت رسانی کو بھی اپنی ذمّے داریوں میں شامل سمجھے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت سے پہلے بھی اس طرح کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جس کی وجہ سے قوم آپؐ کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتی تھی۔ وحی کے نزول کے بعد جب آپؐ پر ایک طرح کی گھبراہٹ طاری تھی تو اُم المومنین حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے انھی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ کو تسلی دی تھی کہ آپؐ رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں' لوگوں کے لیے مشقت اٹھاتے ہیں' مہمانوں کی خاطر تواضع میں کسر نہیں چھوڑتے اور لوگوں کی راحت رسانی کے لیے ایسے ایسے کام کرتے ہیں جو عام طور پر نایاب ہیں۔ اس

لیے اللہ تعالیٰ آپؐ کو ضائع نہیں کرے گا۔

صحابہ کرامؓ خدمتِ خلق کو کتنی اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ آپ ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مسجد میں اعتکاف کر رہے تھے کہ ایک شخص پریشان و مغموم آپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے پریشانی کا سبب معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ فلاں شخص کا مجھ پر قرض ہے اور میں ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ حضرت ابن عباسؓ فوراً مسجد سے نکل کر اُس شخص کے پاس گئے اور اس سے (مہلت دینے کے لیے) بات کی۔ مقروض شخص نے عرض کیا: آپ تو اعتکاف میں ہیں، کیا بھول گئے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، بھولا نہیں، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور یہ زیادہ دن کی بات بھی نہیں (اور یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے) کہ ''جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کے لیے قدم اٹھائے اور پوری کر دے تو یہ اس کے لیے دس برس کے اعتکاف سے زیادہ بہتر ہوگا''۔

مسلمان کی زندگی خیرخواہی، عالی ظرفی اور میانہ روی سے عبارت ہوتی ہے اور وہ پورے وقار اور ذمّے داری کے ساتھ اپنی ہر ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

انسانی مساوات

انسانوں کے ساتھ سلوک میں یہ بات بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ (حضرت آدمؑ و حواؑ) کی نسل سے ہیں۔ ان میں کسی طرح کا نسلی امتیاز نہیں ہے۔ دنیا کی حیثیت ایک گلشن کی ہے اور مختلف قوم و وطن اور مختلف رنگوں کے لوگ اس گلشن کے رنگ برنگے پھولوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اس گلشن کے حسن کا ذریعہ ہے ورنہ ایک ہی رنگ کے پھول اسے کشش سے محروم کر دیتے۔ پھر علم و فضل، صحت و جسم، مال و دولت وغیرہ کی تقسیم خدا کی طرف سے ہے۔ ان میں کسی بھی بنیاد پر دوسرے انسانوں کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ خدا کے نزدیک بہتر صرف وہ ہوگا جو زیادہ پاک باز ہوگا، لہٰذا ذہن میں کسی طرح کے تعصب و تنگ نظری کو دخل نہیں دینا چاہیے اور جب ذہن میں کوئی تنگ نظری نہیں ہوگی تو معاشرے میں عدل و

انصاف کا بول بالا ہوگا جس سے پورا ماحول سازگار ہوگا۔

اتحاد پسندی

فرد معاشرے کا ایک جزو ہوتا ہے' اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ اختلاف کا شکار ہوں بلکہ انھیں وحدت کا سبق دیا ہے۔ توحید کے ماننے والوں پر تو یہ اور بھی لازمی ہے کہ وہ وحدت کی لڑی میں پروئے رہیں' اسی لیے جماعت کے ساتھ نماز کا ثواب تنہا نماز سے پچیس گنا رکھا گیا ہے۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان خود اپنے دائرے میں محدود ہو جائے بلکہ یہ ہدایت دیتا ہے کہ دیگر بھائیوں کے ساتھ منسلک و مربوط ہو کر رہا جائے۔ باہمی پھوٹ تو طاقت ور قوموں کو بھی کمزور کر دیتی ہے اور کمزور قوموں کو تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔

کسی بزرگ سے کہا گیا کہ جلدی سے مسجد پہنچیے' لوگ باہم لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے دریافت کیا: کس بات پر؟ بتایا گیا کہ کچھ لوگ تراویح آٹھ رکعتیں پڑھنا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ ۲۰ رکعتیں۔ آپ کے فیصلے کا شدت سے انتظار ہو رہا ہے۔ بزرگ نے کہا: میرا فیصلہ یہ ہے کہ مسجد بند کر دی جائے اور اس میں تراویح کی نماز کی اجازت نہ دی جائے' کیونکہ تراویح کی نماز نفل ہے اور مسلمانوں کا اتحاد فرض ہے۔ فرض کو ختم کرنے والی نفل نماز کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

جب انسان کے ذہن میں یہ سب باتیں صاف رہیں گی' وہ کسی تعصب و تنگ نظری کا شکار نہیں ہوگا۔ بہترین کردار و اخلاق ہر وقت اس کے ذہن نشین ہوں گے تو اس کے طرزِ عمل پر لازماً ان باتوں کا بہترین اثر پڑے گا اور بہترین سلوک کا نمونہ بن سکے گا۔

انسانی طرزِ عمل کی کج ادائیوں پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی اس روایت میں خاص طور پر روشنی ڈالی گئی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں تمھارے برے لوگوں کے بارے میں نہ بتا دوں؟ لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسولؐ اللہ! اگر آپؐ پسند

فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں برا وہ ہے جو اکیلا سفر کرتا ہے‘ اپنے غلام کو پیٹتا ہے اور کسی کو مدد نہیں پہنچاتا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمھیں اس سے زیادہ برے کے بارے میں نہ بتا دوں؟ لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسولؐ اللہ! اگر آپؐ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: جو لوگوں کو ناپسند کرتا ہو اور لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمھیں اس سے زیادہ برے لوگوں کے بارے میں نہ بتا دوں؟ لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسولؐ اللہ! اگر آپؐ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: جو کسی لغزش کو قبول نہیں کرتے نہ کوئی معذرت قبول کرتے ہیں نہ کوئی خطا معاف کرتے ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں اس سے زیادہ برے کے بارے میں نہ بتا دوں؟ لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسولؐ اللہ! آپؐ نے فرمایا: جس سے بھلائی کی امید نہ کی جائے اور جس کے شر سے محفوظ نہ سمجھا جائے۔ (طبرانی)

انسانی کلوننگ

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ: ابوسعد

دین اسلام حصول علم اور بحث وتحقیق کو ایک پسندیدہ امر قرار دیتا ہے۔ اُمت مسلمہ پر یہ فرض کفایہ ہے کہ وہ اُن تمام شعبہ ہائے علوم میں دسترس اور مہارت پیدا کرے جو اس کے دین اور دنیا سنوارنے کے لیے مطلوب ہیں یہاں تک کہ علوم وفنون کے ہر اختصاص اور شعبے میں وہ خود کفیل ہو جائے اور اغیار کی محتاج نہ رہے۔ اسلام کا تصور علم یہ ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق کی طرح معیشت، سیاست، جنگ، سب کچھ دین کے تقاضوں پر پورے اُترنے والے ہوں۔ اسلام اس نظریے کا قائل نہیں کہ دنیاوی امور کا رشتہ دین اور اخلاق سے منقطع کر دیا جائے۔ جیسا کہ حریت علم، حریت اقتصاد، حریت سیاست وحرب کا نعرہ لگانے والے یہ باور کراتے ہیں کہ دین اور اخلاق کو ان امور سے الگ تھلگ رہنا چاہیے کیونکہ اس طرح ترقی کی راہ کھوٹی ہوتی ہے، اس کا میدان تنگ ہو جاتا ہے اور حرکت وایجاد ماند پڑ جاتی ہے۔ درحقیقت اسلام ایسے تمام نظریات کو رد کرتا ہے جس سے علم واقتصاد اور سیاست وغیرہ میں بگاڑ اور فساد در آتا ہے اور یہ شرط عائد کرتا ہے کہ زندگی میں تمام کام دین کے تابع ہونے چاہییں۔

شریعت اسلامی کا مزاج جو تمام صریح نصوص، واضح فقہی اصول اور مقاصد عامہ کی رعایت سے اخذ شدہ ہے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسانی کلوننگ اختیار کی جائے۔ اس کے اختیار کرنے سے درج ذیل مفاسد پیدا ہونے کا یقینی خطرہ موجود ہے۔

تنوع کی نفی

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو تنوع کے ساتھ قائم کیا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ تخلیق عباد کے ساتھ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے رنگ مختلف ہیں۔ اس طرح مختلف رنگ کا ہونا تنوع کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں''۔ (فاطر ۳۵: ۲۷-۲۸)

کلوننگ تصور کائنات سے ان رنگوں کو مٹا دینا چاہتی ہے چونکہ وہ ایک ہی طرح کے متعدد اجسام ڈھالنے کی دعوے دار ہے۔ اس کے سبب انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی معاملات میں مفاسد کا در آنا یقینی ہے۔ اس کا کچھ ادراک ہر صاحب عقل کرسکتا ہے اور مزید کچھ مفاسد شاید ابھی احاطۂ ادراک میں نہ آسکیں۔

ایک ایسی درس گاہ کا تصور کیجیے جس میں کلوننگ سے پیدا شدہ طلبہ زیرتعلیم ہیں۔ کس طرح استادان طلبہ کی شناخت کا معما حل کر سکے گا؟ وہ کیسے معلوم کرے گا کہ ان میں کون کون ہے؟ اسی طرح ایک تفتیش کرنے والا پولیس آفیسر ارتکاب جرم پر مجرم کو کیسے گرفتار کر سکے گا، جب کہ ایک ہی چہرے، قدوقامت اور انگلیوں کے نشانات رکھنے والے بیسیوں افراد جاے واردات پر موجود ہوں؟ اسی طرح ایک شوہر اپنی بیوی کو کس طرح پہچانے گا، جب کہ اس کے سامنے صد فی صد مشابہ یا فوٹو کاپی کی گئی کئی عورتیں ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس بات کا ہرگز اطمینان نہیں ہے کہ کلوننگ شر کے لیے استعمال نہ ہو۔ آج جوہری طاقت اور دیگر مہلک ہتھیار بڑے پیمانے پر زمین اور اس پر بسنے والے انسانوں کی تباہی و بربادی کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ کون ہمیں یہ ضمانت دیتا ہے کہ بڑی طاقتیں اور ان کے حلیف کلوننگ کے عمل سے ایک قوی اور وحشی فوج تیار کر کے دیگر اقوام کو

روند نہ ڈالیں گے؟ کون ہمیں یہ یقین دلا سکتا ہے کہ یہ بڑی طاقتیں کلوننگ کا استعمال صرف اپنے لیے خاص نہیں کر لیں گی اور دیگر اقوام کے لیے اس کے استعمال پر پابندی نہیں لگا دیں گی؟ جیسا کہ ایٹمی اسلحے کے سلسلے میں انھوں نے کیا ہے۔

سنت زوجیت کی نفی

کلوننگ کی جو کچھ معلومات ہم تک پہنچ رہی ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے رشتۂ ازدواج کی بیخ کنی ہوتی ہے اور اس کائنات کی سنتِ زوجیت پر ضرب پڑتی ہے جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مرد اور عورت کی شکل میں جوڑے بنائے ہیں۔ اسی طرح سے حیوانات میں پرند، چرند، کیڑے مکوڑے اور دیگر اصناف میں نر اور مادہ بنائے اور تمام نباتات میں بھی یہ سنت قائم و دائم ہے۔ جدید علوم سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جوڑے یا زوجیت کا تصور جمادات میں بھی موجود ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بجلی، مثبت اور منفی عناصر سے عبارت ہے۔ یہاں تک کہ ایک ذرے (atom) کے اندر بھی الیکٹران اور پروٹان کی شکل میں یہ حقیقت جلوہ گر ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

> پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں سے یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔ (یٰسٓ ۳۶:۳۶)

اس کے برعکس کلوننگ ایک جنس واحد کی تکرار اور دوسری جنس سے لاتعلقی کو فروغ دیتی ہے۔ اس پس منظر سے وہ امریکی عورت پوری طرح آگاہ ہے جس نے کہا کہ کلوننگ کی کامیابی کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ دنیا مستقبل میں صرف اور صرف عورتوں کی ہوگی۔ دراصل کلوننگ اس فطرت سے بغاوت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کی تخلیق کی۔ اس کے ذریعے انسانیت کی بھلائی کی تلاش ایک فعل عبث ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے عین مطابق صرف افزایش نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ ایک دوسرے کی طمانیت اور تکمیل کی خاطر جنس مخالف کا محتاج رہتا ہے۔

مرد اور عورت ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان میں باہم اُنس اور مودت رکھی گئی ہے۔ ان کی اولاد کو ان دونوں کی مزید شدت سے ضرورت رہتی ہے۔ وہ اس خاندان کے محتاج رہتے ہیں جہاں پر ماں کی محبت اور باپ کی نگہداشت انھیں میسر آئے۔ اور یہی تعلق انھیں اپنے خاندان اور معاشرے کی خیرخواہی پر اُکساتا ہے اور ان کے اندر جود و عطا‘ تفاہم باہمی اور خیر کے لیے تعاون جیسی کیفیات پیدا کرنے کا محرک بنتا ہے۔

لوگ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ طویل تر عہد طفولیت انسانوں ہی میں پایا جاتا ہے جو کئی برسوں پر محیط ہوتا ہے۔ اس کے دوران بچہ اپنے ماں باپ اور خاندان کے مادی اور اخلاقی سہارے کا قدم قدم پر محتاج ہوتا ہے۔ اس کی تربیت مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ والدین اس سے پیار و محبت سے نہ پیش آئیں اور اپنی محنت کی کمائی اس پر خرچ نہ کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے۔ والدین عام طور سے اولاد کے لیے جو کچھ کرتے ہیں اُس پر خوش رہتے ہیں‘ نہ اپنے احسانات شمار کرتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف ہی کا احساس اولاد کی پرورش میں مانع ہوتا ہے۔ لیکن کلوننگ مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے فطری تعلق سے آزاد کرتی ہے اور اُس خاندان کی بنیاد ڈھا دیتی ہے جہاں انسان پرورش پاتے ہیں اور ان کی اولین تربیت ہوتی ہے۔

کلوننگ شدہ انسانوں میں رشتے ناطے

جس انسان سے مادہ لے کر کلوننگ کی جائے گی اور جو نومولود ہوگا‘ ان میں کیا رشتہ و تعلق ہوگا؟ یہ ایک بڑا معمّا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نومولود ایک الگ وجود رکھتا ہے چاہے وہ اپنے محسن/ ہم زاد کی مکمل اور مماثل جسمانی‘ عقلی اور نفسیاتی صفات رکھتا ہو۔ لیکن وہ ایک معنی میں دوسرا بھی نہیں ہے بلکہ ان دونوں میں صرف زمانی اختلاف ہے۔ دیگر صفات کی مماثلت کے باوجود نومولود ایک نئی شخصیت میں ڈھل جائے گا۔ اسے مختلف ماحول اور ثقافت میسر آئے

گی۔ چونکہ عقیدہ، سلوک اور معرفت کسب کیے جاتے ہیں، وراثت سے سرشت کا حصہ نہیں بن جاتے، اس طرح یہ نیا شخص ہی شمار کیا جائے گا۔ لیکن اس کا اپنے سینیر (senior) سے کیا رشتہ ہوگا؟ کیا وہ بیٹا ہوگا؟ یا بھائی ہوگا؟ یا لاتعلق ہوگا؟ یہ ایک بنیادی سوال اُٹھے گا۔ بعض لوگ قیاس کرتے ہیں کہ وہ بیٹا ہوگا کیونکہ وہ اس کا جز ہے۔ لیکن یہ بات اسی وقت منطقی ہوگی جب کہ مادہ رحمِ مادر میں ڈالا جائے، اور اس کی طبیعی طریقے پر ولادت ہو۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ''ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے'' (المجادلة ۵۸:۲)۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نومولود کی ماں ہوگی اور باپ نہیں ہوگا۔

بعض حضرات کی رائے میں یہ جڑواں بھائی ہوگا لیکن بھائیوں کی اصل تو ماں باپ ہوتے ہیں اور جب اصل ہی نہ رہے گی تو فرع کیسے ثابت ہوگی۔

یہ تمام پیچیدگیاں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان تمام مفاسد سے بچنے کے لیے کلوننگ کا انکار کر دیا جائے۔

کلوننگ بغرض علاج

کلوننگ امراض کے علاج میں کس طرح استعمال ہوگی، یہ میں نہیں جانتا۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ کلوننگ شدہ انسان، طفل یا جنین بنائے جائیں تاکہ ان کے اعضا نکال کر مریض انسانوں کے علاج میں کام آئیں تو یہ صورت ہرگز جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ مخلوق باحیات ہے چاہے کلوننگ کے ذریعے ہی پیدایش ہوئی ہو۔ اس لیے اس کے اعضاے جسم کو ضائع نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ ابھی مرحلۂ طفولیت یا جنین ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس کی حرمت وقوع پذیر ہو چکی ہے۔

اگر کلوننگ سے مخصوص اعضاے جسم ہی کی پیداوار ہو سکے جیسے دل، جگر، گردے وغیرہ تاکہ محتاج مریض اور معذور افراد کے کام میں لائے جائیں تو یہ صورت مقبول ہے۔ دین میں پسندیدہ ہے اور باعث ثواب ہے۔ چونکہ یہ طریقۂ کار انسانیت کے لیے نفع بخش ہے اور یہ کسی دیگر مخلوق کو ایذا پہنچائے بغیر، نیز کسی حرمت کو پامال کیے بغیر یہ مقصد حاصل ہو رہا ہے--- اس

لیے اس طرح کے تمام استعمال شرعی حدود کے اندر سمجھے جائیں گے بلکہ یہ مطلوب اور مستحسن کام ہوگا۔ بعض حالات میں بقدر ضرورت اس کی اہمیت وافادیت اور بڑھ جائے گی۔

دو اہم نکات

کلوننگ کے حوالے سے دو مزید نکات غور طلب ہیں:

اولاً یہ کہ کلوننگ جیسا کہ بعض تصور کرتے ہیں کسی جان دار کی بذاتِ خود تخلیق نہیں ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ مادۂ تناسل کو مخصوص طریقے سے نشوونما دینا ہے۔ کلوننگ کے دوران ایک بالغ ذی روح کے جسمانی خلیہ (somatic cell) سے حاصل کردہ مرکزے (nucleus) کو ایک بیضہ (egg) میں داخل کیا جاتا ہے جس کا مرکزہ نکال لیا گیا ہو۔ اس طرح جس مولود کی نشوونما ہوتی ہے اُس میں اُس ذی روح سے جس سے somatic cell nucleus لیا گیا ہو مکمل جینیاتی مماثلت ہوتی ہے۔ اس پورے عمل کی بنیاد بیضہ اور جسمانی خلیہ کا استعمال ہے جس کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ نشوونما اسی فطری دائرے میں ہو رہی ہے جس پر یہ سارا عالم قائم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قائم کیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ شاید کلوننگ کے علم سے دین کے اساسی عقیدے حیات بعد موت کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوگی۔ دورِ قدیم کے مشرکین ہوں یا آج کے مادہ پرست، موت کے بعد زندہ کیے جانے کے تصور کو بعید از حقیقت واہمہ سمجھتے رہے ہیں۔ مگر آج کلوننگ کی ٹکنالوجی یہ ثابت کر رہی ہے کہ صرف بیضہ اور خلیہ کے واسطے سے انسان اپنی اصل شکل وصورت پر پھر سے وجود میں آسکتا ہے۔ پس اگر اس معاملے میں انسان اتنی قدرت حاصل کر سکتا ہے تو کیا اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ انسانوں کو دوبارہ اس مادے سے زندہ کرے جو حدیث میں عجب الذنب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جو انسان سے فنا نہیں ہوتا، یا کسی بھی واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندگی میں لاسکتا ہے جو ہمارے علم سے بعید ہے۔

> وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔ (الروم ۳۰:۲۷)

آیاتِ حجاب وستر اور ''موڈریٹ اسلام''

ڈاکٹر رخسانہ جبیں

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد جہاں مغرب کی ساری توپ وتفنگ کا رُخ عالم اسلام کی طرف پھر گیا ہے اور دنیا بھر میں مسلمانوں کی زندگی حرام کی جا رہی ہے' وہیں میڈیا میں ''اسلام'' پھر سے ایک عنوان بن گیا ہے۔ ایک جانب موڈریٹ اسلام کے علم بردار ہر اُس چیز کو باطل قرار دیتے نظر آرہے ہیں جسے مغرب ناپسند کرتا ہے--- اور دوسری جانب ''اعتدال'' ان کے نزدیک اسلام اور مغرب کے درمیان کسی راستے کا نام ہے۔ پاکستان میں متحدہ مجلسِ عمل کی جزوی کامیابی کے بعد ''عورت'' اور ''پردہ'' کے موضوع پر متعدد مضامین نظر سے گزرے۔ کہیں پردے (برقع) کو پھانسی کا پھندا قرار دیا گیا--- کہیں اسے ایک گٹھڑی میں بند کر دینے کے مترادف کہا گیا' اور کچھ تو اس حد تک پہنچے کہ ان کے خیال میں خیر کے غالب نہ آسکنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ خواتین کا حجاب اوڑھنا بھی ہے۔ افسوس اُمت مسلمہ کے ان اسکالروں پر' جنھیں دین کے پھیل نہ سکنے میں اُمت کی حد سے بڑھی ہوئی بے دینی نہیں بلکہ ٹوٹی پھوٹی دین داری ہی نظر آتی ہے۔

ان حالات میں لازم ہے کہ پردے اور حجاب کی آیات کی وضاحت کی جائے تاکہ بہت سے ناپختہ ذہنوں کو شکوک وشبہات سے بچایا جاسکے۔

فی الوقت ہم اپنی بحث ان نکات تک محدود رکھیں گے جو سورۂ احزاب کی آیات ۵۳ اور ۵۹ اور سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۱ پر بحث کر کے اٹھائے جاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی

جاتی ہے:

- سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۳ (آیت حجاب) محض اُمہات المومنین کے لیے ہے۔
- جلباب اور خمر دراصل ایک ہی چیز قرار پاتے ہیں (بڑی چادر اور چھوٹا دوپٹہ)
- الا ما ظھر منھا، میں خوب صورت لباس، چوڑیاں، سرمہ، مہندی --- سبھی کچھ کھول دینا درست ہے۔
- اور قرآن و حدیث میں ان کے خیال میں کوئی ایسا حکم نہیں جو چہرے کے پردے کی تائید کرتا ہو ---
- سورہ احزاب کی آیت نمبر ۵۹ محض ایک ایجابی اور معاشرتی حکم ہے۔

آگے کچھ بھی لکھنے سے قبل ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتی ہوں کہ ہر دور میں دین پر تنقید کرنے والوں نے خود کو ''جدت پسند'' کہا اور اپنے لیے ''عقلیت پسند'' کی اصطلاح استعمال کی --- اور تو اور حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کی دعوت کو ''اساطیر الاولین'' کہہ کر ہی رد کیا گیا اور ایمان و عمل والوں کو ''سفھا'' کہا گیا (اب ہمارے محترم مسلمان محققین اور دانش ور سوچ لیں انھیں یہ اصطلاحات کہاں تک زیب دیتی ہیں)۔

اصل میں دین اسلام ہی جدید ہے --- ''جہالت'' قدیم ترین ہے اور حیا، پردہ، جلباب جدید ہے۔ اس ضمن میں نام نہاد جدید معاشرے دراصل پھر سے قدیم ترین دور کی طرف لوٹ رہے ہیں جو بے پردگی ہی نہیں بے لباسی کا دور تھا -- (اور ہر بے پردگی کی انتہا بے لباس ہی ہوتی ہے) جو جہالت اور تاریکی کا دور تھا۔

اپنے موضوع کی طرف آتے ہوئے میں آغاز سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۳ سے کروں گی جسے صرف ''اُمہات المومنین'' کے لیے مخصوص قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ آیت حجاب کے بارے میں نہیں۔ آیئے اس پر غور کریں۔ ہم نے اس آیت کو آج تک ہر تفسیر میں ''آیت حجاب'' کے طور پر ہی پڑھا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں: ''قرآن کریم میں پردۂ نسواں اور اس کی تفصیلات کے

متعلق سات آیتیں نازل ہوئیں: چار سورۂ احزاب میں، تین سورۂ نور میں گزر چکی ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پردے کے متعلق سب سے پہلے نازل ہونے والی یہی آیت ہے'' (معارف القرآن، ج ۷، ص ۲۱۰)۔

مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں: ''یہی آیت ہے جسے آیت حجاب کہا جاتا ہے''۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۲۱)

اب آیئے آیت کی طرف --- ترجمہ ہے: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو، نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں، اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمھاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے''۔ (الاحزاب ۳۳:۵۳)

مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح کا آغاز یوں کرتے ہیں: یہ اس حکم عام کی تمہید ہے جو تقریباً ایک سال بعد سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں دیا گیا...... اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی شخص، خواہ وہ قریبی دوست یا دور پرے کا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو، آپؐ کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ پھر سورۂ نور میں اس قاعدے کو تمام مسلمانوں کے گھروں میں رائج کرنے کا عام حکم دے دیا گیا۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۲۰)

مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''آیت مذکورہ میں جتنے احکام آئے ہیں ان میں خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج مطہرات کو ہوا ہے مگر حکم عام ہے ساری اُمت کے لیے، بجز اس آخری حکم کے کہ ازواجِ مطہرات کے لیے یہ خصوصی حکم ہے کہ وہ آپؐ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں''۔ (معارف القرآن، ج ۷، ص ۲۰۳)

ہر دانش وراتنی دانش تو رکھتا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد ہی جان سکے کہ اس آیت میں سوائے اُمہات المومنین کے نکاح کی ممانعت کے--- کون سا حکم ہے جس سے کوئی مہذب معاشرہ صرفِ نظر کرسکتا ہو---

دوسروں کے گھروں میں بلااجازت داخل ہونا' کھانے کے اوقات تاکتے رہنا' عین کھانے کے وقت بغیر اجازت چلے آنا' کھانے کے بعد بیٹھ کر دیر تک گپیں ہانکتے رہنا کون سے مہذب معاشرے کے اصول ہیں--- جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے علاوہ کسی اور کو ممانعت کی ضرورت نہیں---؟ اس کو صرف نبیؐ کے گھر والوں کے لیے مخصوص مان لینا اور معاملہ ناسخ و منسوخ تک لے جانا ایک بڑی جسارت ہے جس کی تائید کسی تفسیر سے فراہم نہیں ہوتی'---صرف خیال آرائی کی جاسکتی ہے۔

اس آیت کے جو معنی مختلف مفسرین نے بیان کیے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے بات زیادہ واضح ہوجائے گی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ ''یہ طریقہ تمھارے دلوں کو بھی پاکیزہ رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''بظاہر یہ بات ایک غیر ضروری تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ کسی کو ان سے ایک گلاس پانی بھی مانگنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے بھی پردے کا اہتمام کرے۔ لیکن یہ کوئی تکلیف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کی ایک نہایت ضروری تدبیر ہے''۔ آگے لکھتے ہیں: ''اس زمانے کے مدعیانِ تہذیب اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ مجال نہیں کہیں پر ایک شکن یا ایک دھبہ بھی پڑنے دیں--- لیکن ان کے دل جس گندگی میں لت پت رہیں ان کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی''۔ (تدبر قرآن' ج ۶' ص ۲۶۴)

مفتی محمد شفیعؒ رقم طراز ہیں: ''اس میں بھی اگرچہ سبب نزول کے خاص واقعہ کی بنا پر بیان اور تعبیر میں خاص ازواجِ مطہرات کا ذکر ہے--- مگر حکم ساری اُمت کے لیے عام ہے''۔ آگے لکھتے ہیں: ''اس جگہ یہ بات قابل نظر ہے کہ یہ پردے کے احکام جن عورتوں اور مردوں کو دیے گئے ہیں ان میں عورتیں تو ازواجِ مطہرات ہیں جن کے دلوں کو پاک صاف رکھنے کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت--- لیذھب عنکم الرجس اہل

البیت --- میں مفصل آچکا ہے۔ دوسری طرف جو مرد مخاطب ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ ہیں جن میں بہت سے حضرات کا مقام فرشتوں سے بھی آگے ہے۔ لیکن ان سب امور کے ہوتے ہوئے ان کی طہارت قلب اور نفسانی وساوس سے بچنے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مرد و عورت کے درمیان پردہ کرایا جائے۔ آج کون ہے جو اپنے نفس کو صحابہ کرامؓ کے نفوسِ پاک سے اور اپنی عورتوں کے نفوس کو ازواجِ مطہرات کے نفوس سے زیادہ پاک ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اور یہ سمجھے کہ ہمارا اختلاط عورتوں کے ساتھ کسی خرابی کا موجب نہیں“۔ (معارف القرآن‘ ج ۷‘ ص ۲۰۰)

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: ”اس حکم کے بعد ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔ آیت کا آخری فقرہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہیں انھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے“۔ (تفہیم القرآن‘ ج ۴‘ ص ۱۲۱)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ آیت تو صرف اُمہات المومنین کے لیے ہے--- اور گھروں پر پردے لٹکا لیے تمام مسلمانوں نے--- اور آپؐ نے کسی کو منع بھی نہ فرمایا--- یا پھر مولانا مودودیؒ اور دوسرے مفسرین غلط کہہ رہے ہیں‘ معاذ اللہ!

مولانا مودودیؒ تو اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ”اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے رُو در رُو بات کرنے سے روکتی ہے‘ اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مصلحت یہ بتاتی ہے کہ ”تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے“‘ اُس میں سے آخر یہ نرالی روح کیسے کشید کی جاسکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں عورتوں کا بے تکلف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی

کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے کہ یہ اسلام کی ''روح'' ہے جو میں نے نکال لی ہے۔ آخر وہ اسلام کی کون سی روح ہے جو قرآن وسنت کے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے؟'' (تفہیم القرآن ' ج ۴' ص ۱۲۱-۱۲۲)

مفتی محمد شفیعؒ نے حجاب کے احکامات کی پوری تفصیل اسی آیت کے ذیل میں بیان کی ہے اور اس میں اب کوئی شک نہیں رہنا چاہیے کہ یہ کوئی ''پیوند'' یا ''سہارا'' نہیں--- بلکہ اصل آیت حجاب یہی آیت ہے۔

اب آیئے سورہ نور کی آیت ۳۱ کی طرف۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس میں منہ ڈھانپنے کا ذکر نہیں ہے اور الا ما ظھر منھا کی تشریح میں چہرہ' خوب صورت لباس' سرمہ' چوڑیاں' مہندی لگے ہاتھ سب کچھ کھول دینے کو استثنا میں شامل کرتے ہیں۔ تو پھر ان سے پوچھا جانا چاہیے کہ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اور اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا میں فرق کیا ہے؟

آیئے پہلے آیت کا ترجمہ دیکھیں: اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں' اور بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے' اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے ...... (مکمل فہرست محرم رشتہ داروں کی) ...... وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے''۔ (النور ۲۴:۳۱)

اس کی تشریح میں ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: ''عورتوں کو بھی اپنی عصمت کا بچاؤ کرنا چاہیے۔ بدکاری سے دُور رہیں۔ اپنا آپ کسی کو نہ دکھائیں۔ اجنبی غیر مردوں کے سامنے اپنی زینت کی کسی چیز کو ظاہر نہ کریں۔ ہاں' جس کا چھپانا ممکن ہی نہ ہو اس کی اور بات ہے' جیسے چادر' اُوپر کا کپڑا وغیرہ جس کا پوشیدہ رکھنا عورتوں کے لیے ناممکن ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد چہرہ' پہنچوں تک کے ہاتھ اور انگوٹھی ہے--- لیکن ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ یہی زینت کے وہ محل ہیں جن کے ظاہر کرنے سے شریعت نے ممانعت کر دی ہے''۔ حضرت اسماءؓ والی

حدیث (جس میں آپؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ عورت جب بالغ ہو جائے تو چہرے اور ہاتھ کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آنا چاہیے) بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ مُرسل ہے۔ خالد بن دریکؒ اسے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان کا مائی صاحبہ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں واللہ اعلم!'' (تفسیر ابن کثیر' ج ۳' ص ۵۰۰)

مفتی محمد شفیعؒ معارف القرآن میں لکھتے ہیں: ''عورت کے لیے اپنی زینت کی کسی چیز کو مردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں بجز ان چیزوں کے جو خود بخود ظاہر ہو ہی جاتی ہیں اور عادتاً ان کا چھپانا مشکل ہے' وہ مستثنیٰ ہیں۔ ان کے اظہار میں کوئی گناہ نہیں۔ مراد اس سے کیا ہے؟ اس میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا: ما ظھر منھا میں جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اوپر کے کپڑے ہیں' جیسے برقع یا لمبی چادر جو برقع کے قائم مقام ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ اس لیے فقہاے اُمت میں اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں پردے سے مستثنیٰ ہیں یا نہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر ڈالنے سے فتنے کا اندیشہ ہو تو ان کا دیکھنا جائز نہیں۔

''قاضی بیضاوی اور خازن نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مقتضا اس آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لیے اصل حکم یہی ہے کہ وہ اپنی زینت کی کسی چیز کو بھی ظاہر نہ ہونے دے۔ بجز اس کے جو نقل و حرکت اور کام کاج کرنے میں عادتاً کھل ہی جاتی ہیں۔ ان میں برقع اور چادر بھی داخل ہیں اور چہرہ اور ہتھیلیاں بھی۔

''جن فقہا نے چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنے کو جائز قرار دیا ہے وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو چہرہ وغیرہ دیکھنا بھی ناجائز ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حُسن اور زینت کا اصل مرکز انسان کا چہرہ ہے اور زمانہ فتنہ و فساد اور غلبہ ہویٰ اور غفلت کا ہے--- اس لیے بجز مخصوص ضرورتوں کے' مثلاً علاج معالجہ یا کوئی شدید خطرہ وغیرہ' عورت کو غیر محارم کے سامنے قصداً چہرہ کھولنا بھی ممنوع ہے''۔ (معارف القرآن' ج ٦' ص ۴۰۱-۴۰۲)

مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصا مبہم بنا دیا ہے' ورنہ بجائے خود بات بالکل صاف ہے۔ پہلے فقرے

میں ارشاد ہوا ہے: لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ "وہ اپنی آرایش و زیبایش کو ظاہر نہ کریں"۔ اور دوسرے فقرے میں اِلَّا بول کر اس حکم نہی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ ہے مَا ظَھَرَ مِنْھَا۔ "جو کچھ اس آرایش و زیبایش میں سے ظاہر ہو، ظاہر ہو جائے"۔ اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اس کا اظہار اور اس کی نمایش نہ کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے چادر کا ہوا سے اُڑ جانا اور کسی زینت کا کھل جانا)، یا جو آپ سے آپ ظاہر ہو (جیسے وہ چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہرحال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے، اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہرحال وہ اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے۔ اس پر خدا کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اس آیت کا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حسن بصری، ابن سیرین اور ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مفسرین نے مَا ظَھَرَ مِنْھَا کا مطلب لیا ہے مَا یظھرہ الانسان علی العادۃ الجاریۃ (جسے عادتاً انسان ظاہر کرتا ہے)، اور پھر وہ اس میں منہ اور ہاتھوں کو ان کی تمام آرایشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں...... یہ مطلب ابن عباسؓ اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے۔ اور فقہاء حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے (احکام القرآن للجصاص، ج ۳، ص ۳۸۸-۳۸۹)۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مَا ظَھَرَ کے معنی مَا یُظْھِرُ عربی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ "ظاہر ہونے اور "ظاہر کرنے میں" کھلا ہوا فرق ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر "ظاہر کرنے" سے روک کر "ظاہر ہونے" کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اس رخصت کو ظاہر کرنے کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور ان روایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ عہد نبویؐ میں حکم حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں، اور حکم حجاب میں منہ کا پردہ شامل تھا، اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں۔ حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے۔ رہا حجاب، تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے جسے عورتوں اور

غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکامِ حجاب کی ہے''۔(تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۳۸۶)

یہ دونوں تفاسیر اتنی واضح ہیں کہ کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا۔ حضرت اسماء کے--- باریک لباس والی روایت ستر سے متعلق ہے (جسے ابن کثیر مرسل قرار دیتے ہیں)۔ اس سے حجاب پر استدلال غلط استدلال ہے۔ اور عورت کو عورۃ قرار دینے والی حدیث کو محض ایک تکریم قرار دے کر ستر و حجاب سے نکال دینا--- گویا 'جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے' والی بات ہے۔ ورنہ ''عورہ'' کے مفہوم سے کون واقف نہیں۔

رہی یہ بات کہ نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہی اس وقت جاتا ہے جب چہرہ کھلا ہو۔ اس کے جواب میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: ''اس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی تبھی تو غضِ بصر کا حکم دیا گیا' ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا جا چکا ہوتا تو پھر نظر بچانے اور نہ بچانے کا کیا سوال۔ یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعہ کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں' جب کہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں پردہ رائج ہونے کے باوجود بہرحال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہٰذا محض غضِ بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مستلزم ہے۔

''اور واقعہ کے اعتبار سے یہ اس لیے غلط ہے کہ سورۂ احزاب میں احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کا رائج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ واقعہ افک کے متعلق حضرت عائشہؓ کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے اس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صفوان بن معطل وہاں سے گزرا تو دور سے کسی کو پڑے دیکھ کر ادھر

آ گیا--- وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ حجاب کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھے پہچان کر جب اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے اپنا منہ ڈھانک لیا (بخاری' مسلم' احمد' ابن جریر' سیرت ابن ہشام)''۔(تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۳۸۱)

ہمارے لیے اُمہات المومنین ہی نمونہ ہیں۔ وہ چراغِ راہ ہیں۔ ان کے حجاب سے اشاعت دین کے راستے نہ رُکے تو ان شاء اللہ ہمارے حجاب سے بھی نہ رُکیں گے۔ ہمیں اس پر پوری طرح شرح صدر ہے کہ یہی ہمارے رب کا منشا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعبیر ہے۔

پھر بھی آیئے سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۹ پر بھی غور کرلیں کیونکہ یہ ہمارے موقف کی بھرپور تائید کرتی ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں' بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو اپنے اُوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔

اس کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں: سورۂ نور میں یاد ہوگا اعزہ واقربا سے متعلق یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب وہ اجازت کے بعد گھروں میں داخل ہوں تو گھر کی عورتیں سمٹ سمٹا کر رہیں۔ اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں۔ یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بڑی چادروں (جلابیب) کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ یہ واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ یہ ہدایت اس صورت سے متعلق ہے جب عورتوں کو باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس کا دوسرا واضح قرینہ یہ ہے کہ یہاں لفظ خمار' نہیں بلکہ جلباب استعمال ہوا ہے۔ جلباب کی تشریح اہل لغت نے یوں کی ہے: ھو الرداء فوق الخمار ۔جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو اوڑھنی کے اُوپر لی جاتی ہے...... قرآن نے اس جلباب سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انھیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی جلباب ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بوڑھیوں

میں اب بھی رائج ہے۔ اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس برقع کو اس زمانے کے دلدادگان تہذیب' اگر تہذیب کے خلاف قرار دیتے ہیں تو دیں' لیکن قرآن مجید میں اس کا حکم نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے جس کا انکار صرف وہی برخود غلط لوگ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسول سے زیادہ مہذب ہونے کے مدعی ہوں۔ (تدبر قرآن' ج ۶' ص ۲۶۹)

مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: آیت مذکورہ میں حرہ آزاد عورتوں کے بارے پردہ کے لیے یہ حکم ہوا ہے۔ جلابیب جمع جلباب کی ہے جو ایک خاص لمبی چادر کو کہا جاتا ہے۔ اس چادر کی ہیئت سے متعلق حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ وہ چادر ہے جو دوپٹے کے اُوپر اوڑھی جاتی ہے (ابن کثیر)۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی ہیئت یہ بیان فرمائی: ''اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اُوپر سے یہ چادر لٹکا کر چہروں کو چھپالیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں'' (واضح رہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ستر میں ہتھیلیاں اور چہرہ کھولنے کی اجازت دی ہے لیکن یہاں حجاب کے ذیل میں چہرہ ڈھکنے کا حکم دے رہے ہیں)۔ (معارف القرآن' ج ۷' ص ۲۳۳)

مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اصل الفاظ ہیں: يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ۔ جلباب عربی زبان میں بڑی چادر کو کہتے۔ اِدْنَاء کے اصل معنی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں۔ مگر جب اس کے ساتھ 'علٰی' کا صلہ آئے تو اس میں 'اِرْخَاء' یعنی اُوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض مترجمین اور مفسرین مغربی مذاق سے مغلوب ہو کر اس لفظ کا ترجمہ صرف لپیٹ لینا کرتے ہیں تاکہ کسی طرح چہرہ چھپانے کے حکم سے بچ نکلا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا مقصود اگر وہی ہوتا جو یہ حضرات بیان کرنا چاہتے ہیں تو وہ يُدْنِيْنَ اِلَيْهِنَّ فرماتا --- اس آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر ان کا ایک حصہ یا پلو اپنے اُوپر سے لٹکا لیا کریں' جسے عرف عام میں گھونگھٹ ڈالنا کہتے ہیں۔

''یہی معنی عہد رسالت سے قریب ترین زمانے کے مفسرین بیان کرتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن المنذر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عبیدہ السلمانی سے

اس آیت کا مطلب پوچھا...... انھوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر اٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔ ابن عباسؓ بھی قریب قریب یہی تفسیر کرتے ہیں...... یہی تفسیر قتادہ اور سدی نے بھی اس آیت کی بیان کی ہے۔

''عہد صحابہؓ اور تابعینؒ کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخ اسلام میں گزرے ہیں انھوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ امام ابن جریر طبری کہتے ہیں: یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ، یعنی شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھروں سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے''۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۲۹)

مولانا مودودیؒ اس آیت پر بحث سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا خلاف --- اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطہ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے --- بہرحال اگر وہ تعبیر کی بددیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا یہ تسلیم کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے''۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۳۲)۔

ستر کے احکامات میں بھی جو حضرات چہرہ اور ہتھیلیاں اور کلائی کو ستر سے مستثنیٰ رکھتے ہیں انھوں نے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ فتنہ اور شہوت کا ڈر نہ ہو تو یہ استثنا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ نے آیت حجاب (سورۂ احزاب ۵۳) کے تحت پوری تفصیل لکھی ہے جو اس بحث کو سمیٹتی بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: پردہ نسواں سے متعلق قرآن مجید کی سات آیات اور حدیث کی ۷۰ روایات کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مطلوب شرعی حجاب اشخاص ہے --- یعنی عورتوں کا وجود اور ان کی نقل و حرکت مردوں کی نظروں سے مستور ہو۔ جو گھروں کی چاردیواری

یا خیموں اور معلق پردوں کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں حجاب کی منقول ہیں وہ سب ضرورت کی بنا پر اور وقت ضرورت اور قدر ضرورت کے ساتھ مفید اور مشروط ہیں۔

''قرآن وسنت کی رو سے اصل مطلوب یہی درجہ ہے۔ سورۂ احزاب کی زیر بحث آیت ۵۳ اس کی واضح دلیل ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح سورہ احزاب ہی کے شروع کی آیت وَقَرْنَ فِی بیوتکن ہے۔ ان آیتوں پر جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اس سے اور زیادہ اس کی تشریح سامنے آجاتی ہے۔ (اس کے بعد انھوں نے اُمہات المومنین کے حجاب کے واقعات لکھے ہیں اور مولانا مودودی کی تشریح گزر چکی ہے جس میں انھوں نے تمام صحابہ کرام کے گھروں پر پردے لٹک جانے کا ذکر کیا ہے)۔

''شریعت اسلامیہ ایک جامع اور مکمل نظام ہے جس میں انسان کی تمام ضروریات کی پوری رعایت کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسی ضرورتیں پیش آنا ناگزیر ہے کہ وہ کسی وقت گھروں سے نکلیں۔ اس کے لیے پردے کا دوسرا درجہ قرآن وسنت کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک برقع یا لانبی چادر میں پورے بدن کو چھپا کر نکلیں۔ یہ صورت بھی باتفاق فقہاے اُمت ضرورت کے وقت جائز ہے۔ مگر احادیث یہ ہدایات دیتی ہیں کہ خوشبو نہ لگائے ہوں، بجنے والا زیور نہ پہنا ہو، راستہ کے کنارے پر چلے۔ مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو وغیرہ۔

''تیسرا درجہ شرعی، جس میں فقہا کا اختلاف ہے یہ ہے کہ سر سے پیر تک سارا بدن مستور ہو مگر چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں۔ جن حضرات نے الا ما ظھر کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی ہے ان کے نزدیک چونکہ چہرہ اور ہتھیلیاں حجاب سے مستثنیٰ ہوگئیں اس لیے ان کو کھلا رکھنا جائز ہوگیا۔ جن حضرات نے ما ظھر سے برقع جلباب وغیرہ مراد لی ہے وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ جنھوں نے جائز کہا ہے ان کے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ فتنے کا خطرہ نہ ہو۔ مگر چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اس کا چہرہ ہے اس لیے اس کو کھولنے میں فتنے کا خطرہ نہ ہونا شاذ و نادر ہے اس لیے انجام کار عام حالت میں ان کے نزدیک بھی چہرہ وغیرہ کھولنا جائز نہیں۔

’’ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ تینوں اماموں نے تو پہلا مذہب اختیار کرنے، چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی خواہ فتنے کا خوف ہو یا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہؒ نے دوسرا مسلک اختیار فرمایا مگر خوفِ فتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا۔ چونکہ عادتاً یہ شرط مفقود ہے اس لیے فقہا حنفیہ نے بھی غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔ (اس کے بعد وہ فتح القدیر، مبسوط، شمس الائمہ سرخسی اور علامہ شامیؒ کے ردالمختار سے فتوے نقل کرتے ہیں جن میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے زمانے میں فتنہ کے خوف سے عورت کو چہرہ نہ کھولنا چاہیے نہ کہ عورہ ہونے کی وجہ سے)

آگے لکھتے ہیں: ’’اس کا حاصل یہ ہوا کہ اب بالاتفاق ائمہ اربعہ تیسرا درجہ پردے کا ممنوع ہوگیا کہ عورت برقع یا چادر وغیرہ میں پورے بدن کو چھپا کر مگر صرف چہرے اور ہتھیلیوں کو کھول کر مردوں کے سامنے آئے۔ اس لیے اب پردے کے صرف پہلے دو درجے رہ گئے کہ اصل مقصود، یعنی عورتوں کا گھروں کے اندر رہنا--- بلاضرورت باہر نہ نکلنا اور دوسرا برقع وغیرہ کے ساتھ نکلنا، ضرورت کی بنا پر بوقتِ ضرورت و بقدرِ ضرورت‘‘۔ (معارف القرآن، ج ۷، ص ۲۱۷-۲۲۰)

اس ساری بحث کو اگر غیر جانب داری کے ساتھ پڑھا جائے تو شارع کا منشا یہی ہے جو اُوپر لکھا ہے اور صاف سمجھ میں آ رہا ہے--- اگر پردے کے حکم کو آپ شرعی حکم تسلیم نہیں کرتے، ایجابی حکم تسلیم کرتے ہیں اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اُس وقت اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں جب معاشرہ پاکیزہ ترین نفوس پر مشتمل تھا تو آج کے معاشرے، آج کے دورِ فتن میں آپ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی ترغیب دیتے ہیں جب شیطان ہر وقت کھلا پھر رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جلباب کو خمر بنا دیا گیا ہے--- اور الا ما ظھر منھا کی آڑ میں تمام تر زینت کھول دینے کو درست قرار دے دیا گیا ہے--- تاکہ تمام فتنہ پرور لوگ اپنے نفوس اور شیطانی نگاہوں کو خوب تسکین دے سکیں۔

کیا یہی وہ معاشرتی اصلاح کا تصور ہے جو قرآن نے پیش کیا اور جس پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے عمل کر کے دکھایا---؟ اُمہات المومنین اور صحابیات کی سیرت

طیبہ کیا یہی تصویر پیش کرتی ہے؟ جنت کی سردار خاتونؓ کا عمل کیا تھا---؟ جنت کی تلاش ان کے اسوہ حسنہ میں ہے یا کہیں اور---؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین بیوی کی زندگی کیسی تھی؟ اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبتوں کی تلاش میں ہم تو اسی کی جستجو کریں گے۔ ساری دنیا کے مفسرین کسی معاملے میں اختلاف کرنے لگ جائیں تو جس تفسیر کی شہادت اسوہ حسنہ اور اسوہ صحابہؓ سے ہوگی وہی تفسیر صحیح ہوگی۔ دانش وری اور عقلیت کے سارے فلسفے بیکار ہیں اگر وہ روحِ قرآنی سے خالی ہیں۔ وہ دانش و عقل کا سرچشمہ صحابہ کرامؓ کے مثالی معاشرے کے بجائے وہ آج کے گمراہ ترین معاشروں میں تلاش کرتے ہیں اور ان سے مرعوب ہو کر معذرتیں پیش کرتے ہیں' حجاب' ستر' اور عورۃ کے معنی بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ کس لیے---؟

کبھی آپ نے اس عورت سے پوچھا بھی سہی جو مکمل شرعی حجاب اُوڑھتی ہے۔ اپنے رب کے حکم کے مطابق جلباب لیتی ہے' اپنی سج دھج دکھاتی نہیں پھرتی---اس کے احساسات کیا ہیں---؟ یہ ہمدردی آپ کس سے کرتے ہیں؟ یہ باحجاب عورت کے کرب کا اظہار ہے یا اس عورت کے جذبات کا جس نے کبھی پردہ کیا ہی نہیں--- اور اس کے خلاف واویلا کرتی پھرتی ہے---؟

جس نے رب کی اطاعت کا مزہ چکھا ہی نہیں' جو دن رات ایک طرف رب کی نافرمانی کر رہی ہے--- دوسری طرف اس کے احکامات کو مغرب کی کسوٹی پر پرکھ کر کبھی ظالمانہ اقدامات---کبھی پھانسی کا پھندا قرار دے رہی ہے' یہ تو اس عورت کے احساسات ہیں--- کبھی آپ نے معلوم کیا کہ جو شعوری طور پر اس حجاب کو اختیار کرتی ہے اس کے جذبات کیا ہیں؟---

- یہ حجاب ہمارے لیے ایک تحفظ ہے۔ ایک تکریم ہے جو ہمارے رب نے ہمیں دی ہے۔ وہ تکریم جو کسی بے حجاب خاتون کو کبھی میسر نہ ہوئی۔
- یہ حجاب اوڑھ کر ہم خود کو میدانِ جہاد میں باطل کے خلاف نبرد آزما مجاہد کی طرح سمجھتے ہیں۔

○ آج جب دین اجنبی ہو چکا ہے ہم باحجاب خواتین' بارِش بھائیوں کی طرح اس کی اجنبیت کو دُور کرنے والے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں ہماری موجودگی معاشرے میں روح اسلامی کے جاری و ساری رہنے کی علامت ہے۔

اس کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے والے بھی جان لیں--- اس رب کی قسم جس نے یہ حجاب ہمارے اُوپر فرض کیا ہے' یہ کسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ آج کی پڑھی لکھی باشعور' باحجاب عورت نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ ہم نے میڈیکل کی تعلیم--- ہاؤس جاب' کلینک' سبھی کچھ مکمل حجاب میں کیا۔ ہماری ساتھیوں نے یونی ورسٹیوں میں اعلیٰ پوزیشن بھی لی۔ آج ٹیچنگ بھی کر رہی ہیں' ریسرچ اسکالر بھی ہیں--- مختلف دوسرے اداروں میں کام بھی کر رہی ہیں اور اب اسمبلیوں میں بھی اپنے فرائض ادا کرنے کو موجود ہیں--- اس کے علاوہ کون سی ترقی ہم سے چاہتے ہیں---؟ منفی کام---؟ منفی شعبے؟۔ مردوں کی پسند کے وہ شعبے جہاں انھوں نے اپنی تسکین کے لیے بنی سنوری خواتین بھرتی کر رکھی ہیں---؟ ایسی ترقی پر ہم لعنت بھیجتی ہیں۔

بے حجابی' بے حیائی کا نکتہ آغاز ہے۔ اور یہ وہ خرابی ہے جو کبھی تنہا نہیں آتی' مخلوط معاشرے کی تمام تر خباثتیں ساتھ لاتی ہے۔ گلوبل ویلج نے ان خباثتوں کو راز نہیں رہنے دیا۔ یہ اللہ کے خوف سے کیا گیا مکمل حجاب ہی اِن کا سدِّ راہ بن سکتا ہے' کیونکہ فرمان رب کے مطابق......

ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ ط (الاحزاب ۳۳:۵۳)

یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔

اخوان المسلمون: تحریکی اور عالمی مسائل

نئے مرشد عام استاذ مامون الھضیبی سے انٹرویو

ترجمہ: حافظ محمد عبداللہ

سوال: کیا نائب مرشد عام نوجوان نسل سے لینے کی بات بھی ہو رہی ہے؟

مرشد عام: ہمارے دستور کے مطابق نائب چننے کا اختیار مرشد عام کو حاصل ہے' وہ جسے چاہے اپنا نائب منتخب کرلے۔ اب' جب کہ ہم مرشد عام کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں عنقریب نائب کے نام کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ جہاں تک اخوان المسلمون میں نئی نسل کے کردار کی بات ہے تو میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اخوان کی قیادت حتیٰ کہ فیصلہ ساز ادارے مکتب الارشاد' میں بھی نوجوان موجود ہیں اور فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں یہاں ڈاکٹر عبدالمنعم عبدالفتاح کی مثال دوں گا۔ انھیں تقریباً سات سال قبل ۱۹۹۵ء میں قاہرہ میں ہونے والے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مکتب الارشاد کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۴۴ برس تھی۔ مکتب الارشاد کی ساری قیادت باقاعدہ جمہوری طریقے سے منتخب شدہ ہے۔

○ کہا جا رہا ہے کہ جماعت کے اندر مختلف پالیسیوں پر اختلاف موجود ہے' اور جماعت کی صفوں میں نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان کش مکش جاری ہے؟

□ اختلافات کی سب خبریں بالکل بے بنیاد اور اس بڑے منصوبے کا حصہ ہیں جو ہمارے خلاف جاری پروپیگنڈا وار اور نفسیاتی جنگ کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ ہم دنیا کے طالب نہیں ہیں اور نہ کوئی ایسی جماعت ہی ہیں جس میں مناصب کے لیے لڑائی جھگڑے ہوتے

ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ اخوان کی سوچ اور طریقہ کار سے واقف نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایک اور اہم حقیقت کو بھی نظرانداز کر جاتے ہیں کہ ملک کے عام شہریوں کو حاصل آزادیاں اور حقوق بھی ہم سے چھین لیے گئے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر بھولنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اخوان المسلمون اس وقت بے پناہ دباؤ' انتہائی رکاوٹوں اور دھونس دھاندلی کی فضا میں کام کر رہی ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ ہم اخوان پر عائد پابندیوں کو تو بھول جائیں اور مرشد عام اور نائب مرشد عام کے انتخاب اور کردار پر بات شروع کر دیں؟ تاہم اخوان المسلمون نے اپنے بہترین نوجوانوں کو بڑی بڑی ذمہ داریوں پر فائز کیا ہے تاکہ وہ بھی کام کا وسیع تجربہ حاصل کرلیں۔

نوجوان مکتب الارشاد میں بھی موجود ہیں اور پیشہ ورتنظیموں اور پارلیمانی پارٹی میں بھی۔ بطور مثال میں میڈیکل ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عصام العریان کا نام لوں گا۔ انھیں اخوان المسلمون نے سیشن ۱۹۸۷ء کے لیے پارلیمنٹ میں اپنا امیدوار نامزد کیا تھا۔ اللہ کے فضل وکرم سے وہ کامیاب ہو کر پارلیمنٹ کے افتتاحی اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ کیا آپ جانتے ہیں ان کی عمر اس وقت کیا تھی ؟ صرف ۳۱ برس۔ یہ مثال ان لوگوں کے اعتراضات کا شافی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ اخوان نوجوانوں کے فعال کردار کے مخالف اور ان کے آگے آنے میں حائل ہیں۔

○ کیا جماعت کے باقاعدہ ترجمان کا نام بھی طے ہو چکا ہے؟

□ حقیقت یہ ہے کہ اخوان المسلمون میں اس نام کا کوئی منصب نہیں ہے۔ مرشد عام ہی معاملات سے بہتر انداز میں واقف ہوتے ہیں اس لیے دستور اور ضابطے کے مطابق جماعت اور اس کی پالیسیوں کے ترجمان بھی وہی ہوتے ہیں۔ اسی طریقۂ کار پر امام حسن البنا شہید' محترم حسن الہضیبی اور استاذ عمر التلمسانی رحمہم اللہ کے ادوار میں عمل ہوتا رہا ہے۔

○ لیکن ۱۰ برس تک ذرائع ابلاغ پر آپ کا نام بطور ترجمان لیا جاتا رہا ہے؟

□ جی ہاں! ہمارا دستور مرشد عام کو یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ وہ کسی کو اپنا یا جماعت کا ترجمان مقرر کریں. میں یہ بتاتا چلوں کہ باقاعدہ ترجمان مقرر کرنے کی روایت استاذ

حامد ابوالنصرؒ کے دور میں پڑی۔ اس کا بھی ایک عجیب قصہ ہے۔ جنگِ خلیج کے دوران جب عالمی ذرائع ابلاغ نے اخوان المسلمون کے موقف سے آگاہ رہنے کا خصوصی اہتمام کیا تو خبر رساں ایجنسیوں' اخبارات اور عالمی ریڈیو ٹی وی کے نمایندوں کا مرکزی دفتر میں تانتا بندھ گیا۔ جسے دیکھو مرشد عام کا بیان یا انٹرویو لینا چاہتا ہے۔ مرشد عام اس سے بڑی تھکاوٹ اور بوجھ محسوس کرتے۔ ایک دن ایک نیوز ایجنسی کا نمایندہ مرشد عام سے ملنے کے لیے دفتر میں آیا۔ جب وہ مجھ تک پہنچا تو پوچھنے لگا: کیا جماعت میں نمبرایک آپ ہی ہیں؟ میں نے کہا: اول تو کیا میری حیثیت تو ثانوی بھی نہیں ہے۔ نمایندہ کہنے لگا: میں تو صفِ اول کے قائد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر میں نے ناظم دفتر مرحوم ابراہیم شرف کو مہمان کی رہنمائی کرنے اور استاذ حامد ابوالنصرؒ سے ملوانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ صحافی پھر میرے سامنے کھڑا ہے ۔میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی کیا معاملہ ہوا ہے؟ اخباری نمایندے نے بتایا کہ مرشد عام کہتے ہیں کہ ہضیبی سے انٹرویو کرو' وہی نمبرایک ہے۔ انٹرویو کی تکمیل کے بعد استاذ ابوالنصر نے اپنی اور جماعت کی ترجمانی کا فریضہ مستقل طور پر مجھے سونپ دیا۔ اس دن سے لے کر پانچویں مرشد عام استاذ مصطفیٰ مشہورؒ کی وفات تک میں ہی جماعت کا باقاعدہ ترجمان رہا ہوں۔

○ آپ جماعتی ڈھانچے میں پڑنے والی دراڑوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر جماعت کے اندر سے جو نئی فکری لہریں اٹھ رہی ہیں اور نئی نئی تنظیمیں وجود میں آرہی ہیں' ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ جماعت ان لہروں کو اپنے اندر سمونے کی استطاعت نہیں رکھتی؟

□ جس دعوت سے لاکھوں افراد وابستہ ہوں اور جسے دعوتی کام کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ بیت چکا ہو اس کے اتنے طویل سفر میں اس کے حامیوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ دوران سفر بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب چند رفقا اصل دھارے کو چھوڑ کر منزل تک پہنچنے کے لیے نیا راستہ اور نیا منہج اختیار کر لیتے ہیں اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت بھی دیتے ہیں۔ اس فطری عمل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کسی طور پر بھی درست نہیں' اور ان اختلافات کو جماعت کے وجود کے لیے عظیم خطرات سے تعبیر کرنا خام

خیالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جہاں تک جماعتی نظم و ضبط کا تعلق ہے تو اسے آپ پوری دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اخوان المسلمون کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یونٹس وہاں کے عوام کو متحرک کرنے والی واحد حقیقی، اور فعال سیاسی قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عناصر جنھیں اپنا اور اپنی کرسیٔ اقتدار کا خوف لاحق ہوتا ہے اس منظم قوت کو کنٹرول کرنے اور عامۃ الناس کو اس سے دور رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔

○ اخوان المسلمون اور عرب ممالک کی حکومتوں کے درمیان تعلقات کا مستقبل آپ کی نظر میں کیا ہے؟ کیا شام اور تیونس کی مانند تعلقات میں تصادم اور جمود کی موجودہ کیفیت برقرار رہے گی؟ یا آنے والے چند برسوں میں آپ کی حکمت عملی میں بنیادی فرق آئے گا؟

□ میں دوبارہ کہوں گا کہ ہم کسی سے تصادم نہیں چاہتے، خاص طور پر اپنے ممالک کی حکومتوں سے تو بالکل بھی نہیں۔ ہم بھی اور دنیا بھر میں موجود اخوان المسلمون کے تمام یونٹس بھی اسی اصول پر عمل پیرا ہیں۔ حکومتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کا انحصار بڑی حد تک ان ممالک کی حکومتوں پر ہے۔ ہم دنیا بھر کی اسلامی اور عرب حکومتوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے عوام کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کریں، اور اپنے عوام کو منصفانہ ترقی، حقیقی آزادی اور حریت کے یکساں مواقع فراہم کریں۔

○ اخوان المسلمون کو کئی عرب ممالک میں اب تک قانونی حیثیت کیوں حاصل نہیں ہو پائی؟

□ یہ سوال تو ان ممالک پر مسلط حکومتوں سے کرنے کا ہے جن کا بدنما چہرہ پکار پکار کر ان کے ظلم و ستم کا اعلان کر رہا ہے یا جو ظلم و ستم سے داغ دار چہرے کو نام نہاد جمہوری پردے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بارہا اعلان کیا جا چکا ہے کہ ہم ۲۴ گھنٹے کے مختصر نوٹس پر قانونی اور دستوری تقاضوں پر پورا اترنے والی سیاسی جماعت بن سکتے ہیں اور اگر موقع ملے تو مصر ہی نہیں بلکہ الجزائر، سوڈان، یمن، اردن، لبنان اور کویت میں بھی قانونی تقاضوں پر پورا اترنے والی پہلی جماعت ہم ہی ہوں گے۔

○ ایک ایسے وقت میں، جب کہ امریکہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کے گرد دائرہ تنگ

کر رہا ہے الجزائر' بحرین' پاکستان اور مراکش میں اسلام پسندوں کی نمایاں کامیابی اور ترکی میں تقریباً دو تہائی اکثریت سے برسر اقتدار آنے کی آپ کیا توجیہہ کریں گے؟

❑ اسلام پسندوں کی یہ کامیابیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ امت میں بیداری کا عمل جاری و ساری ہے اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود اپنے دین کا محافظ ہے۔ جان لینا چاہیے کہ اقوام عالم کی ضرورت صرف اور صرف اسلام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ورلڈ آرڈر دنیا کے مسائل کا حل نہیں۔ جبر و قہر کا ہر ہتھیار اور عقیدۂ اسلامی کو مٹانے' مغربیت زدگی کو عام کرنے اور مسلمانوں کو افتراق و انتشار سے دوچار کرنے کی ہر کوشش کا انجام مکمل ناکامی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مسلم حکومتوں کو چاہیے کہ اپنے رویے پر نظرثانی کریں اور اپنی صفوں میں انتشار و افتراق کے بیج بونے اور اپنے اور حاملین دعوت اسلامی کے مابین فاصلوں کو ہرگز نہ بڑھنے دیں۔ ہمارا پختہ خیال ہے کہ انتخابات خواہ دنیا میں کہیں پر بھی ہوں اگر منصفانہ ہوئے تو ان شاء اللہ اسلام پسند ہی کامیاب ہوں گے۔ اپنے حکمرانوں کو چننے کا اصل حق عوام کو ہی حاصل ہے۔ اگر عوام ہی اپنے حکام کے انتخاب کا حق رکھتے ہیں اور عوام اور حکام کے درمیان تعاون ضروری ہے تو پھر باہم اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ کرنا چاہیے نہ کہ ایسی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کا جس سے قوتیں ضائع جائیں اور ملک ترقی کی بجائے تنزل کی طرف بڑھنے لگے۔

عبداللہ گل کی حکومت ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ انصاف و ترقی پارٹی کو استنبول جیسے بڑے شہر کی مالی حالت سدھارنے کا کامیاب تجربہ بھی حاصل ہے اور پارٹی کے پاس مختلف علوم کے بہت سے ماہرین بھی موجود ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی ثابت قدمی کے لیے دعاگو ہیں۔

○ آپ کی جماعت کا فلسطین کی تحریک مزاحمت کے بارے میں کیا موقف ہے؟ اور فلسطینی عوام کی مدد کے لیے اب تک آپ نے کیا خدمات سرانجام دی ہیں؟

❑ ذرائع ابلاغ ہم سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جیسے ہم کوئی حزب اقتدار ہوں اور سیاسی قوت کی باگیں بھی ہمارے ہی پاس ہوں' اور ہم سے اس طرح کے سوالات شروع کر دیتے ہیں کہ آپ نے اس مسئلے کے حل کے لیے کیا خدمات سرانجام دی ہیں؟ ذرائع ابلاغ اس حقیقت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ ہمیں ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا

ہے۔ جہاں تک مسئلہ فلسطین کا تعلق ہے' ہمارے نزدیک اس مسئلے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ہمارے دین کا جز بھی ہے اور اس کے لیے مدد بھی ہم پر فرض ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز ہم سے اس بارے میں پوچھا جانا ہے۔ اور قیامت کے دن یقیناً تمام حکمرانوں سے بھی ضرور پوچھا جائے گا کہ اس معاملے میں کیوں کوتاہی کی اور فلسطینیوں کو دشمن کا تر نوالہ بننے کے لیے کیوں تنہا چھوڑ دیا کہ شارون اور اس کے حواری جب چاہیں انھیں گرفتار اور قتل کرتے پھریں۔

○ اگر فلسطینی مسلمانوں کی مدد کے لیے جہاد کی کوئی عملی صورت سامنے آئے تو آپ کا اقدام کیا ہوگا؟

□ اگر جہاد کا موقع آیا اور فلسطینی مسلمانوں کو نوجوانوں کی ضرورت پڑی تو ہم اپنے بہترین بیٹے اس راہ میں قربان کر دیں گے۔ میرے خیال کے مطابق فلسطینی مسلمانوں کو اس وقت نوجوانوں کی نہیں بلکہ طبی' مالی اور فوجی اسلحے کی صورت میں مدد کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ وہ زندہ رہ سکیں اور یہودیوں کی طرف سے اجاڑے گئے گھر' کھیت و کھلیان کو نئے سرے سے آباد کر سکیں۔ انھیں میڈیا کی اور عامۃ الناس کی تائید و حمایت کی بھی ضرورت ہے' اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کا ہتھیار ہیں۔ فلسطینیوں کی حمایت میں نکلنے والے یہ مظاہرے اور ریلیاں بالواسطہ طور پر حکمرانوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے عملی اقدامات کریں۔ اگر ہمیں سیاسی آزادیاں میسر ہوں تو ہم ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنے بھائیوں کی حقیقی ضروریات سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور ان کی اہم ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیش رفت بھی کر سکتے ہیں۔ اگر مصری قوم کو موقع دیا جائے تو وہ اس خطے کی تمام اقوام کی رہنمائی کر سکتی ہے۔

○ امریکہ کی طرف سے عراق کے خلاف جنگ کی دھمکی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

□ ہم عراق کے مظلوم عوام کے شانہ بشانہ ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حملے کا اصل ہدف عراقی عوام کو امریکہ کی طاقت و جبر کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دینا ہے۔ عراق کی تباہی دراصل اسرائیلی طاقت میں اضافے کے مترادف ہے۔ بار بار کی ہمہ پہلو تفتیش کے بعد بھی

امریکہ اب تک ایسے ٹھوس شواہد اکٹھے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ جنھیں عراق پر حملے کے جواز میں پیش کیا جا سکے۔

○ ۱۱ستمبر کے حادثے کے بعد ایک بڑی اسلامی پارٹی ہونے کی حیثیت سے عالمی سطح پر آپ اپنے آپ کو کس سیاسی مقام کا حامل پاتے ہیں؟

□ امریکہ نے ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے کا اسلامی نظریہ حیات وعقائد' اسلام' مسلمان اقوام اور ان کی ریاستوں پر حملے کے لیے بدترین استعمال کیا ہے۔ ان امریکی اقدامات سے بدنیتی' تعصب اور پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی واضح طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس کی یہ نفرت آمیز کارروائیاں مسلمانوں کی غالب اکثریت میں امریکہ اور اس کی ظالمانہ پالیسیوں کے خلاف شدید ردعمل کا باعث بن رہی ہیں۔

امریکہ کے ان تمام اقدامات کے برعکس اسلام کی دعوت بڑھتی اور ترقی ہی کرتی جارہی ہے۔ دعوت کے پھیلاؤ کا یہ سلسلہ اب کسی حال میں بھی رک نہیں سکتا۔ امریکہ کی ظالمانہ روش کے خلاف تحریک اسلامی اور ساری امت کی جدوجہد میں دن بدن تیزی ہی آتی جائے گی۔

مسلمانوں کی غالب اکثریت کا ایمان ہے کہ مادی قوت' ایمانی قوت کا کبھی بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ امریکہ اور اس کے حواری خاص طور پر وہ لوگ جنھیں امریکہ نے مسلم ممالک میں اقتدار پر مسلط کیا ہوا ہے' جو کچھ بھی کر لیں ان کی ہر کوشش کا انجام بالآخر ناکامی ہے۔ یہ لوگ اسلامی احکام و مبادی کی تبدیلی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے دین کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اس کا فرمان ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○ (اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔ الحجر ۱۵:۹) گذشتہ کئی صدیوں سے قرآنی نصوص اور صحیح احادیث نبویہ سے کھیلنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ان کوششوں کا انجام ہمیشہ ناکامی کی صورت میں نکلا ہے: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ○ (یوسف ۱۲:۲۱) ''اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔

○ اگر امریکہ اخوان المسلون کو بھی دہشت گرد جماعتوں کی فہرست میں شامل کر لے اور آپ کی جماعت سے وہی سلوک شروع کر دے جو وہ مختلف جہادی تنظیموں سے کر رہا ہے

تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟

☐ ہم مقابلہ اور جنگ نہیں چاہتے۔ فرمان نبویؐ ہے کہ لا تتمنوا لقاء العدو فاذا لقیتموھم فاثبتوا (دشمن سے مڈبھیڑ کی خواہش نہ کیا کرو لیکن اگر سامنا ہو تو ثابت قدمی دکھاؤ)۔ اللہ پر ہمارا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ امریکہ کو چاہیے کہ عدل و انصاف کی روش اختیار کرے اور ملت اسلامیہ سے مکالمے کا آغاز کرے اور اپنی وحشیانہ طاقت کے بل بوتے پر دنیا بھر میں اپنی ظالمانہ پالیسیاں نافذ کرنا چھوڑ دے۔ امریکی قوم کو بھی چاہیے کہ اپنی انتظامیہ کی پالیسیوں پر کڑی نظر رکھے۔ انھی پالیسیوں نے پوری دنیا میں ان کے خلاف نفرت و عداوت کے بیج بوئے ہیں۔

○ سابقہ ادوار میں کئی بار یہ بات سامنے آئی ہے کہ آپ کی جماعت امریکہ سے روابط بڑھانے پر غور کر رہی ہے تاکہ کچھ عرب تنظیموں کے متبادل کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر سکے۔ کیا یہ اطلاعات درست ہیں؟ کیا آپ کے اور امریکی انتظامیہ کے مابین گذشتہ ۳۰ برس میں کوئی رابطہ ہوا ہے؟ کیا واقعی آپ اپنے آپ کو ان عرب تنظیموں کا متبادل سمجھتے ہیں؟

☐ اس سوال کا ہر جز ایک طبقے کی بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس خبر میں کسی قسم کی کوئی صداقت موجود نہیں ہے۔ ہماری تمام سرگرمیاں معلوم و معروف اور سب لوگوں کی دیکھی بھالی ہیں۔ ہم سب امریکی حملے کی زد میں ہیں اور اس حملے سے بچاؤ کے لیے ہم سب لوگوں کو ایک وسیع تر پلیٹ فارم کی تشکیل کی دعوت دیتے ہیں۔

○ ایک طرف تو آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ عالمی تحریک ہیں' جب کہ دوسری جانب آپ کا کہنا یہ ہے کہ دیگر ممالک میں موجود اخوان المسلمون کی جماعتوں کے معاملات میں ہم دخل نہیں دیتے اس طرح آپ کا عالمی جماعت ہونے کا دعویٰ کہاں باقی رہتا ہے؟

☐ اسلام کے ایک آفاقی دعوت ہونے اور آپ کے قول: اھل مکة ادرىٰ بشعابها (اہل مکہ ہی مکہ کی گھاٹیوں کو جانتے ہیں)۔ میں تضاد تلاش کرنا کارِلاحاصل ہے۔ ہمارا طریقہ کار' اسلوب تربیت اور عمومی قواعد و ضوابط ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ البتہ ان کی عملی تطبیق کا طریقہ ہر ملک کے حالات کی مناسبت سے جدا جدا ہے۔

○ آپ اپنے آپ کو عالمی سطح کی تنظیم تو قرار دیتے ہیں' جب کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ وغیرہ کے استعمال میں آپ بہت پیچھے ہیں؟

□ اللہ کے فضل سے ہم کسی میدان میں بھی پیچھے رہنے والے نہیں۔ ہمارے پاس قابل اور جدید علوم کے ماہر افراد موجود ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم جن ممالک میں رہ رہے ہیں ان کی حکومتوں نے میڈیا کے آزادانہ استعمال پر کئی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک رپورٹ کے مطابق میڈیا اور انٹرنیٹ کا سب سے زیادہ استعمال اخوان المسلمون سے وابستہ لوگ کرتے ہیں۔

○ آپ کا کیا خیال ہے کہ اخوان المسلمون جن سیاسی اصطلاحات میں بات کرتی ہے وہ موجودہ دور' درپیش مشکلات اور چیلنجوں سے مطابقت رکھتی ہیں؟

□ ہم ایک نظریاتی جماعت ہیں اور ہمارا نظریہ اسلام ہے۔ اسلام میں کچھ امور تو محکم اور ثابت شدہ ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ یہ امور تمام علماء اور فقہاء کے نزدیک متفقہ ہیں۔ جن امور میں اجتہاد کی گنجایش ہے' یعنی مباحات اور معلوم ہونا چاہیے کہ دین میں ان اجتہادی امور کا میدان بڑا وسیع ہے ان امور کو عصری تقاضوں اور قوموں کے سماجی اور ثقافتی احوال کے مطابق ہونا چاہیے۔ اخوان المسلمون کے موقف کا مطالعہ کرنے والے ہر فرد پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جمود اور ٹھیراؤ ہماری اور تحریک اسلامی کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اسی وجہ سے عرب عوام کے اندر سب سے زیادہ پذیرائی اخوان کے موقف کو حاصل ہے۔

○ آپ کا کیا خیال ہے کہ لٹریچر میں موجود ۷۰ سال پرانے اسلوبِ تربیت جماعت کے لیے مطلوبہ افراد کو کامیابی سے تیار کر رہا ہے؟

□ ہم اپنے اسلوبِ عمل میں مسلسل تبدیلی کرتے رہتے ہیں اور ہر قسم کی تبدیلی کو خوش آمدید بھی کہتے ہیں۔ دراصل یہ جماعت کا اندرونی معاملہ ہے ہوسکتا ہے کہ باہر سے دیکھنے والا تبدیلی کو محسوس نہ کرسکے۔

○ کیا موجودہ دور میں اخوان المسلون کا خلافت راشدہ کے قیام اور احیا کا خواب

غیر حقیقت پسندانہ نہیں ہے؟

□ (انہ لا یبائس من روح اللہ الا القوم الکافرون) ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اس کے ذمے اللہ کے راستے میں سعی و جہد اور اپنی نیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شریعت کے مطابق اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہم امم اسلامیہ کو ان کی ثقافتوں میں قربت پیدا کر کے ایک دوسرے سے قریب کرتے رہیں گے۔ ان کے درمیان اقتصادی تعلقات کو فروغ دینے اور ان کے سیاسی موقف کو ایک بنانے کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے۔

میرا خیال ہے کہ موتمر عالم اسلامی کی تنظیم کو فعال کرنا بھی اس جانب پیش رفت کا باعث ثابت ہوسکتا ہے۔ سرمایہ کاروں کو باہم اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دینے پر آمادہ کرنا اور علمائے کرام اور مفکرین کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنا' علمی بحث و جستجو اور باہمی مکالمے کے مراکز کا قیام بھی اس سلسلے کی اہم کڑیاں ثابت ہوسکتی ہیں۔

○ آپ اپنے اوپر عائد ہونے والے ان الزامات کا کیا جواب دیں گے کہ اخوان المسلمون نے دینی جماعت اور سیاسی پارٹی کے کردار کو خلط ملط کر دیا ہے؟

□ یہ الزام تو گذشتہ ۷۰ برس سے لگایا جاتا رہا ہے اور اس کا جواب تفصیل کے ساتھ بار بار دیا بھی جا چکا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جسے ہر مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ شریعت اسلامیہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اس میں عقیدہ بھی ہے اور اخلاق بھی۔ تمام معاملات کی اصل اور بنیاد شریعت میں موجود ہے۔ اس میں ہمارے انفرادی و اجتماعی مسائل کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ حاکم اور محکوم کا تعلق کیسا ہو؟ نظام معیشت و معاشرت اور نظام سیاست کیا ہو؟ دوسرے ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہونے چاہییں؟ ان سب سوالوں کا جواب دین میں موجود ہے۔ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی' قرآن بھی ہے اور تلوار بھی۔ اگر کوئی اسے خلط ملط کرنا سمجھتا ہے تو سمجھے۔ حقیقت یہی ہے کہ آپؐ اسی اسلام کو لے کر تشریف لائے تھے اور اب بھی مومن درحقیقت وہی ہے جو اس اسلام پر اطمینان قلب اور شرح صدر رکھتا ہو۔

○ آخری سوال یہ ہے کہ آپ اپنی دعوتی و سیاسی سرگرمیاں اخوان المسلمون کے نام سے کرنے پر کیوں مصر ہیں؟ ترکی میں موجود اسلامی تحریک کے تجربے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے جنھوں نے قبولیتِ عامہ کے حصول کے لیے کئی بار اپنا نام تبدیل کیا ہے؟

□ ہم اخوان المسلمون کا نام کیوں نہ اختیار کریں اور اسے تبدیل کرنے کے بارے میں کیوں سوچیں؟ ہمارے نام کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ اس کی ایک تاریخ ہے اور ایک روایت۔ دنیا کے کسی کونے میں اخوان المسلمون کا نام لیا جائے تو سامع کے ذہن میں ایک خاص مفہوم ابھرتا ہے۔ دراصل بہت سی حکومتیں ہمیں اپنے موقف سے ہٹانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ نام کی تبدیلی پر اصرار بھی انھی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔

جہاں تک ترکی کا تعلق ہے تو وہاں کے اپنے مخصوص حالات ہیں۔ (رسالۃ الاخوان ۱۳/۱۲/۲۰۰۲ء)

رسائل و مسائل

چہرے کا پردہ

سوال: میں نے ایک سال پیشتر پردہ شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے دورِ جاہلیت تھا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہدایت کے قابل سمجھا اور ہدایت دی۔ اب، جب کہ پورا پردہ شروع کیا ہے تو چہرے کے پردے کے حوالے سے اختلافی باتوں کا پڑھ کر طبیعت بہت بے زار اور افسردہ ہوتی ہے بالخصوص جب انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ریسرچ اسکالر طارق جان کا نقطۂ نظر روزنامہ جنگ میں ارشاد احمد حقانی کے کالم (۲۸، ۲۹ نومبر ۲۰۰۲ء) میں چھپنے پر نظر سے گزرا۔ مزید افسوس اس لیے بھی ہوا کہ وہ اس ادارے سے وابستہ ہیں جس کے آپ چیئرمین ہیں اور آپ جماعت اسلامی کے نائب امیر بھی ہیں۔ مجھے تو اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے سارے علما صرف سراب ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہم جیسے ہدایت کے پیاسے انھیں پانی سمجھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اگر قرآن کا ترجمہ پڑھیں تو بات واضح لگتی ہے کہ چہرے کا پردہ ضروری ہے۔ میری اس ذہنی اُلجھن کو دُور فرما دیجیے۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے آپ کو پردے کی نعمت سے سرفراز فرما کر جس سعادت سے نوازا ہے، اس پر میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو استقامت بخشے اور دنیا و آخرت دونوں میں اجرعظیم سے نوازے۔ کبھی پردہ مسلم معاشرے اور ثقافت کی پہچان تھا اور آج اسے اختیار کرنا ایک جہاد کے مترادف ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی

سعادت سے نوازا ہے۔ بلاشبہہ آپ کا اپنا شوق اور ہمت ہی وہ چیز ہے جس نے آپ کو اس نعمت سے سرفراز کیا ہے۔

آپ نے روزنامہ جنگ کا جو تراشا بھیجا تھا میں نے اسے انگلستان کے قیام کے دوران ہی پڑھ لیا تھا۔ میں بلاتکلف عرض کرتا ہوں کہ برادرم طارق جان میرے عزیز ساتھی ہیں جو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (آئی پی ایس) میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ البتہ وہ اپنے خیالات کے خود ذمہ دار ہیں۔ نہ وہ میرے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں اور نہ آئی پی ایس یا جماعت اسلامی ہی کا یہ موقف ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ میں اسی حجاب کا قائل ہوں جو ہمارے دور کے مقتدر علما بشمول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے پیش کیا ہے۔ یہی قرآن پاک کی آیات اور احادیث نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے۔ میں چہرے کے حجاب کا قائل ہوں اور میری اہلیہ الحمدللہ اسی پر عمل کرتی ہیں۔ البتہ میں یہ بات ضرور آپ سے کہنا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ میں، ماضی میں بھی اور آج بھی، اسلامی تحریکات اور دینی حلقوں سے وابستہ لوگوں کے درمیان جہاں حجاب کی فرضیت پر کوئی دو آرا نہیں، وہاں حجاب کی تفصیلات کے بارے میں ضرور محدود اور متعین اختلاف پایا جاتا ہے۔ ثقہ علما کا ایک گروہ چہرے کے حجاب کو ضروری سمجھتا ہے اور صرف آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو ما ظھر منھا کے ذیل میں شمار کرتا ہے، جب کہ ماضی کے علما اور فقہا میں سے بہت کم اور آج کے برعظیم پاک و ہند کے علما اور دوسرے اہل علم کے سوا ایک خاصی تعداد اس رائے کی حامی ہے کہ ہاتھ اور پاؤں کے ساتھ بغیر زینت کے چہرہ کھلا رکھا جا سکتا ہے۔ البتہ بال اور گردن ڈھکی ہونی چاہیے۔ عرب دنیا، جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں کے علما اور اسلامی تنظیموں کا بحیثیت مجموعی یہی موقف ہے اور وہاں کی اسلامی تحریکات سے وابستہ خواتین اسی پر عامل ہیں۔ البتہ یہ وضاحت کر دوں کہ وہاں بھی ایک تعداد ایسے علما اور ان کے متبعین کی ہے جو چہرے کے حجاب کے قائل ہیں۔

میں نہ اپنے آپ کو فتویٰ کا اہل سمجھتا ہوں اور نہ کبھی یہ جسارت کی ہے۔ میرا اپنا تعامل ان علما کی رائے کے مطابق ہے جو چہرے کے حجاب کے قائل ہیں۔ لیکن یہ زیادتی ہوگی کہ جو لوگ اپنے دلائل کے مطابق چہرے کے حجاب کے قائل نہیں ہیں، انھیں اس زمرے میں ڈال دیا

جائے جو بے پردگی اور مغربی ثقافت و بے حجابی کے قائل ہیں۔ ہمیں جہاں اس راستے کو اختیار کرنا چاہیے اور اسی پر استقامت کا ثبوت دینا چاہیے جسے ہم شرعی دلائل یا معتبر علما کی رائے کے احترام کی بنیاد پر اختیار کرتے ہیں اور بجا طور پر اس پر ہمیں اطمینان اور فخر ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے اجر اور قبولیت کی توقع رکھنی چاہیے وہیں اگر دوسرا نقطۂ نظر کچھ ایسے دلائل کی بنا پر ہے، جو خواہ ہمیں مطمئن نہ کر سکے لیکن جس کی نسبت شریعت کے ماخذ ہی کی طرف ہو تو ہمیں اس کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فقہ کے مختلف مکاتب فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں یہ اختلاف بڑا ہی نمایاں اور بظاہر تضاد تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود صحیح راستہ یہی ہے کہ اس پورے اختلاف کو اپنی حدود میں رکھا جائے، تکفیر، تنقیص اور تضحیک کا راستہ اختیار نہ کیا جائے۔ عبادات سے لے کر معاملات بلکہ حدود کی سزاؤں تک میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسے اختلاف ہی رہنا چاہیے۔ افتراق اور تصادم کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔ میں مثالیں دینے سے عملاً احتراز کر رہا ہوں اور صرف اصولی بات تک اپنی گزارش کو محدود رکھ رہا ہوں۔ البتہ اختلاف الفقہا کے موضوع پر کتابوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور شاہ ولی اللہؒ کی کتاب اس بارے میں ایک مفید علمی ماخذ ہے۔

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے جو عملی راستہ اختیار کیا ہے اس پر آپ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں لیکن چاہوں گا کہ آپ اگر اس بارے میں اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کریں تو وہ دین کے مزاج اور مصالح سے قریب ترین ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین پر قائم رکھے اور حق کو حق جان کر اس کے اتباع کی توفیق دے۔ (پروفیسر خورشید احمد)

توبہ کا بار بار ٹوٹنا

س: میں ایک خوف زدہ شخص ہوں۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے۔ والدین کے بارے میں، بھائیوں کے بارے میں ہر وقت منفی خیالات آتے رہتے ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

لیکن پھر بھی خود پر کنٹرول نہیں ہے۔ اس خوف کے لیے میں نے علاج بھی کروایا ہے مگر حالت جوں کی توں ہے۔

اصل میں مجھے اپنے نفس پہ کنٹرول نہیں ہے۔ میں نے ایک کام نہ کرنے کی توبہ کی' پھر توڑ دی' دوبارہ توبہ کی اس پر پھر قائم نہیں رہ سکا' بار بار توبہ کی اور توڑ دی۔ کیا مجھے اللہ معاف کر دے گا؟ کیا مجھے سکون مل سکے گا؟

ج: گناہ پر ندامت اور اس بات کا خوف کہ نفس پر قابو نہ ہونے کی بنا پر کہیں کسی غلطی کا ارتکاب نہ ہو جائے لازمی طور پر ایک پریشان کن صورت ہے لیکن ساتھ ہی یہ نہ بھولیے کہ جب تک احساسِ گناہ دل میں پایا جائے گا اس وقت تک ان شاء اللہ ایمان بھی سرگرم رہے گا۔ دراصل انسان کا نفس ایک تو وہ ہے جو اپنے رب کے احسانات و انعامات کے احساس کے ساتھ پورے اطمینان کے ساتھ اس کی رضا کا پابند ہو جائے۔ یہ نفس مطمئنہ ہے۔ ایک نفس وہ ہے جو وساوسِ شیطانی کی بنا پر نفس کو برائی کی طرف اُکساتا ہے۔ یہ نفسِ امارہ ہے' اور تیسرا نفس وہ ہے جو غلط کام کے بارے میں سوچنے' یا برائی کی نیت کرنے' یا غلطی کر بیٹھنے کے بعد انسان کو ملامت کرتا ہے۔ اسے نفسِ لوامہ یا ضمیر کہا جاتا ہے۔ آپ نے جس کیفیت کا ذکر کیا ہے بظاہر اس کا تعلق نفس کی اسی تیسری قسم کے ساتھ ہے۔ دراصل ہم میں سے اکثر افراد خود اپنے بارے میں اور ابلیس اور اس کی ذریت کے بارے میں صحیح تصور نہیں رکھتے اور فرائض دین کی پابندی کرنے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہم شیطان سے محفوظ ہو گئے۔ حالانکہ ہم نماز صرف دن کے پانچ اوقات میں پڑھتے ہیں' روزے عموماً صرف رمضان میں رکھتے ہیں' حج سال میں مخصوص دنوں میں ہوتا ہے' جب کہ شیطان نہ تو کوئی جزوقتی ورکر ہے' نہ وہ سرکاری ملازموں کی طرح وقت چرانے کا عادی ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹے اور اگر ممکن ہو تو اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ اللہ کے بندوں کو بہکانے میں لگا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے حملے ایسے اوقات میں اور ایسے مقامات پر ہوتے ہیں جہاں ہم گمان بھی نہیں کر سکتے۔

اگر ایک شخص سے غلطی کا ارتکاب ہو جائے تو وہ انبیا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے حضرت آدمؑ کے الفاظ میں: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ

مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ (الاعراف ۷:۲۳)، یا حضرت یونسؑ کی زبان میں ادا کی گئی دعا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ق اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ (الانبیاء ۲۱:۸۷)، خلوصِ دل کے ساتھ اور دوبارہ غلطی کا ارتکاب نہ کرنے کے عزم کے ساتھ ادا کرے۔ قرآن کریم نے انسان کی اسی کمزوری کو جانتے ہوئے انسان کو ناامیدی اور پریشانی اور خوف سے بچانے کے لیے جو بنیادی تصور پیش کیا ہے وہ ہر مسلمان کے لیے ہدایت کی روشنی فراہم کرتا ہے۔ فرمایا: ''(بندو) دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے، جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے'' (الحدید ۵۷:۲۱)۔ یہاں اہل ایمان کو اللہ کی مغفرت کی طرف تیزی اختیار کرنے کے ساتھ یہ بات بھی سمجھا دی گئی ہے کہ ایسے لوگوں کا انجام ان شاء اللہ ایسی جنت ہے جس کی وسعت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

قرآن کریم انسانی غلطیوں کے لیے ارتکاب فحش اور ارتکاب برائی (سوء) کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد اللہ کے بندوں کو وثوق کے ساتھ اُمید دلاتا ہے کہ رب کریم ان کی ندامت اور استغفار و توبہ کو آخر دم تک قبول کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وہی تو الرحمٰن والرحیم ہے۔ غافر الذنب اور قابل التوبہ ہے۔ فرمایا: ''اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا'' (النساء ۴:۱۱۰)۔ یہاں عمل سوء کا ذکر ہوا لیکن سورۂ آل عمران میں اس سے زیادہ سخت اصطلاح (فاحشۃ) کا استعمال کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اُوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے'' (۳:۱۳۵)۔

یہاں یہ بات واضح کر دی گئی کہ اگر ایک شخص اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتا اور رب کریم کا ذکر اور استغفار کر کے اس کی طرف پلٹتا ہے تو رب کریم اس کی غلطیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ وہی

تو ہے جو بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کرسکتا ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''بندہ گناہ کرنے کے بعد معافی مانگنے کے لیے جب اللہ کی طرف پلٹتا ہے تو اللہ کو اپنے بندے کے پلٹنے پر اس شخص کے مقابلے میں زیادہ خوشی ہوتی ہے جس نے اپنی اونٹنی جس پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا، کسی بیابان میں گم کردی اور پھر اس نے اچانک اسے پالیا ہو۔ ایسے ہی آدمی کے توبہ کرنے پر اللہ خوش ہوتا ہے بلکہ اللہ کی خوشی اس کے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ وہ رحم وکرم کا سرچشمہ ہے'' (بخاری و مسلم)۔

اس طرح حضرت ابوموسٰی الاشعریؓ سے ایک روایت مسلم میں ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ جس شخص نے دن میں کوئی گناہ کیا ہے وہ رات میں اللہ کی طرف پلٹ آئے، اور دن میں ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں اگر کسی نے گناہ کیا تو وہ دن میں اپنے رب کی طرف پلٹے اور گناہوں کی معافی مانگے حتیٰ کہ سورج مغرب سے طلوع ہو''۔

گویا قیامت کے ظہور تک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کی مغفرت کے لیے منتظر رہتا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر توبہ کی قبولیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا: ''اللہ بندے کی توبہ سانس رکنے سے پہلے تک قبول کرتا ہے'' (ترمذی)، یعنی جب انسان پر سکرات واقع ہو جائے اس سے قبل اگر وہ توبہ کرلے تو رب کریم اسے معاف کر دیتا ہے۔ گویا توبہ واستغفار کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اس لیے نہ کسی خوف میں پڑنے کی ضرورت ہے نہ مایوسی کی۔ اگر ایک مرتبہ غلطی کے بعد معافی مانگ کر کبھی غلطی نہ کرنے کا عہد کیا گیا لیکن اس پر قائم نہ رہا گیا تو دوبارہ توبہ کے بعد توبہ پر قائم رہنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ساتھ ہی رضاکارانہ طور پر اپنے اُوپر یہ پابندی لگائی جائے کہ توبہ کے ہمراہ خصوصی نوافل یا نفلی روزے رکھ کر اپنے آپ کو دوبارہ غلطی سے بچانے کی کوشش کرے، یا اللہ کی راہ میں کچھ انفاق کر کے اپنے عزم کو مزید مستحکم کرے۔ یہی حصول سکون کا طریقہ ہے اور یہی فلاح و کامیابی کا وہ راستہ ہے جو ہمیں قرآن وسنت نے دکھایا ہے۔ (پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد)

کتاب نما

ذکرِ فراہی' ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی۔ ناشر: دارالتذکیر' اُردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۹۶۸۔
قیمت: ۶۵۰ روپے۔

مولانا حمیدالدین فراہی (۱۸۶۲ء-۱۹۳۰ء) قرآنی علوم کے معروف محقق' مفسر اور ترتیب و نظم قرآن میں ایک نئے مکتب فکر کے بانی تھے۔ انھوں نے بقول مولانا مودودی ''مسلسل چالیس برس تک قرآن کی خدمت کی اور معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا۔ [ان کی] تفسیروں سے عرب و عجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا''۔

زیرنظر کتاب ان کے ''سوانح حیات اور تصنیفی کام کے تحقیقی مطالعے'' پر مشتمل ہے۔ یہ علمی منصوبہ ربع صدی قبل مصنف کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اس تحقیق میں بہت کھکھیڑ اٹھائے۔ بارہا بھارت کے مختلف شہروں کا سفر کیا' بیسیوں بلکہ سیکڑوں لوگوں سے ملے' روایات اور بیانات جمع کیے اور متعلقہ اداروں سے بہت سا ریکارڈ حاصل کیا۔ پھر یہ علمی منصوبہ (جیسا کہ مصنف نے اپنے سیرحاصل مقدمے میں ایک لمبی داستان کی صورت' اس کا پس منظر بتایا ہے) ''سرخ فیتے'' کی رکاوٹوں اور ''حاسدوں' مفسدوں' فتنہ پردازوں اور شرپسند عناصر'' کی تخریبی سازشوں کا شکار ہوتا ہوا ''ایک جمبو جیٹ کے ایئرکریش کی طرح تباہ ہوکر رہ گیا۔ اب یہ اس کے ملبے کا کچھ حصہ ہے جو پیش کیا جارہا ہے'' (ص ۹)۔ اگرچہ مصنف کہتے ہیں کہ ''میرا یہ کام اپنی نظر میں بے وقعت ہے'' مگر انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود جس محنت کے ساتھ مواد اکٹھا کیا اور پھر اسے مرتب کرکے موجودہ قاموسی جلد کی شکل میں شائع کیا ہے' وہ قابل داد ہے۔

کتاب میں مولانا فراہیؒ کی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاندانی پس منظر' شجرہ' تاریخ اور جاے پیدایش' عبدالحمید یا حمیدالدین؟ تعلیم کے مختلف مراحل' اساتذہ' ملازمتیں' اسفار' تلامذہ' بیماری' وفات' اولاد اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف' شخصیت کے تابناک پہلو وغیرہ۔ یہ کتاب اپنی جامعیت اور پھیلاؤ میں حالی کی حیاتِ جاوید کی یاد دلاتی ہے۔ ہمارا تاثر یہ ہے کہ ذکرِ فراہی میں حیات شبلی (سید سلیمان ندوی) اور حیاتِ سلیمان (شاہ معین الدین ندوی) سے کہیں زیادہ کاوش و محنت اور جگر کاوی سے کام لیا گیا ہے۔ اور ممدوح کی زندگی کی معمولی جزئیات تک کو جمع کر دیا گیا ہے۔

جناب مصنف نے یہ کام بڑی لگن کے ساتھ انجام دیا ہے۔ مگر کہیں کہیں غیر ضروری تفصیل ملتی ہے اور کہیں وہ غیر متعلق باتوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ اگر کچھ حشو و زوائد نکال دیے جاتے تو کتاب اتنی ضخیم نہ ہوتی اور اس کے علمی معیار میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔

یہ بات کھٹکتی ہے کہ مصنف نے تفصیلی دیباچے میں کئی جگہ تلخ نوائی سے کام لیا ہے اور متنِ کتاب میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے' جیسے انھوں نے مولانا ابوالخیر مودودی کی "بے خبری' غلط اندیشی اور بدگمانی" کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فراہی سے ابوالخیر صاحب کے "بغض و عناد' پر اُنھیں لتاڑا ہے' وغیرہ۔ ہماری رائے میں اس طرح کی تلخی کسی عالم یا اسکالر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ بایں ہمہ اس علمی کارنامے پر اصلاحی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ایسی اہم اور عالمانہ سوانح عمری کے آخر میں اشاریے کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

طریقت کی حقیقت (اول' دوم) چودھری غلام علی۔ پتا: مکتبہ جریدۃ الاتحاد' منصورہ' لاہور۔ صفحات: ۳۴۴' ۱۷۱۔ قیمت' اول: درج نہیں۔ دوم: ۸۰ روپے۔

پندرہ ابواب پر مشتمل یہ دونوں جلدیں طریقت کے باب میں کسی خوش کن تاثر کا اظہار یہ نہیں بن سکیں۔ اس کتاب میں خیالات اس قدر منتشر اور بے ربط ہیں کہ طریقت کے حقائق تک رسائی کارے دارد ہے۔ مراحلِ تصوف کا بیان ترتیب وار ہے اور نہ مکمل۔ تقدیم و

تاخیر کا لحاظ بھی پیشِ نظر نہیں رہا۔ مؤلف کے نزدیک کوئی بھی بات کہیں سے شروع کر کے کہیں پر بھی چھوڑی جاسکتی ہے' چاہے حقیقت افسانے کا رُوپ دھار لے یا افسانہ حقیقت بن جائے۔ پھر طریقت کی حقیقت کے ضمن جس علمی اور تحقیقی اندازِ بیان کی ضرورت تھی' وہ یہاں مفقود ہے۔ زبان اور انشا کی غلطیاں اس پر مستزاد ہیں---لگتا ہے کہ مؤلف درست اور صحیح زبان کے قائل ہی نہیں۔ پروف کی اتنی غلطیاں ہیں کہ شاید ہی کوئی صفحہ اس عیب سے داغ دار نہ ہو۔ اصولِ تالیف کا اس کتاب میں کہیں گزر نہیں--- یہ فقط ایک کتاب ہے' جس کے پانچ سو پندرہ صفحے ہیں۔ متضاد اور متناقض خیالات کے ترجمان۔ مغالطہ انگیزی قدم قدم پر دامن کشاں ہے۔ ربط اور تلازمے کی شدید کمی ہے۔ کتاب کی دونوں جلدیں پڑھ لینے کے بعد' کم از کم میں ذاتی طور پر یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ مؤلف طریقت کے مؤید ہیں یا مخالف---!

مؤلف نے علامہ اقبال کے کلام اور افکار سے بھی استدلال کیا ہے' مگر یک رُخا اور اکہرا---معلوم ہوتا ہے کہ وہ افکارِ اقبالؒ سے براہِ راست فیض یاب نہیں ہوئے' محض اقبالیاتی ادب کے توسط سے اقبال تک پہنچنے کی سعی فرمائی۔ اس صورت میں مغالطے کا شکار ہونا بدیہی اور لازمی امر ہے' بصورتِ دیگر وہ طریقت اور مسائلِ طریقت کی یک رُخی تعبیر نہ فرماتے۔ مثال کے طور پر وحدت الوجود ہی کو لیں۔ بادی النظر میں یہ نظریہ یونانی فلاسفہ کے افکار کا ترجمان بھی ہے اور ویدانت کا پرتو بھی--- اسی طرح انگریزی اصطلاح Pantheism بھی اس کی مترادف اور ہم معنی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ اگر اس نظریے کا بغور مطالعہ کیا جائے' تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ نہ تو یونانی افکار کا ترجمان ہے اور نہ ہی ویدانت کا۔ اسے پین تھی ازم اور مونو ازم سے بھی کچھ علاقہ نہیں۔ یہ ان سب نظریات سے بالکل علاحدہ ہے اور صرف اسلامی تعلیمات سے مستنیر---مگر اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے ٹھوس علمی اور تحقیقی مطالعے کی ضرورت ہے۔ (عبدالعزیز ساحر)

انوار القرآن' مولانا عبدالرحمنؒ، ناشر: سنگت پبلشرز' ۲۵ سی لوئر مال' لاہور۔ صفحات: ۶۰۸ (بڑی تقطیع)۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

متعدد اہل علم نے قرآن حکیم کے لغات تیار کیے ہیں۔ بعض تو ڈکشنری کے طرز پر اور بعض حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق ہیں۔ بعض نے مفردات کو سامنے رکھا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مرحوم نے تلاوتِ قرآن حکیم کی ترتیب کے مطابق الفاظ (اسماء، افعال اور تراکیب و کلمات وغیرہ) کے معنی ومفہوم کی وضاحت کی ہے۔ بعض الفاظ اور کلمات پر مفسرین اور اکابر کی رائے بھی دی ہے۔ انھوں نے ہر اہم کلمے کو درج کرنے کے بعد، پہلے اس کا مصدر یا مادہ (اگر ہوتو) بیان کیا ہے، پھر اس کلمے کی صرفی حیثیت اور نحوی مقام بتایا ہے) پھر اس کے مفہوم میں اہل لغت اور اہل تفسیر سے حوالے نقل کیے ہیں اور جہاں ممکن ہوا ہے وہاں صحیح احادیث سے کلمات کا مفہوم متعین کیا ہے'' (ص ۶۰۷)۔ گویا یہ قرآن حکیم کے الفاظ کا ایسا لغت ہے جس میں کہیں کہیں معنی ومفہوم کی وضاحت اور تعین کے لیے مختلف مفسرین سے بھی مدد لی گئی ہے۔

یہ کام بڑی محنت کا تھا جسے مصنفِ مرحوم نے اپنے تبحر علمی کی مدد سے بخوبی مکمل کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن سکول میں مدرس تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد دیوبند سے دورۂ حدیث مکمل کیا اور پھر تصنیف وتالیف میں مصروف ہوئے۔

مطالعۂ قرآن اور فہمِ قرآن کے سلسلے میں عام قاری کے لیے یہ ایک مفید معاون کتاب ہے۔ ۱۹۵۶ء کی پرانی کتابت کا عکس شائع کر دیا گیا ہے۔ اگر از سرِنو مشینی کتابت (کمپوزنگ) کرائی جاتی تو ۶۰۰ صفحات کا یہ لغت چار، ساڑھے چار سو صفحات میں بخوبی سما سکتا تھا اور قیمت بھی کم ہوتی۔ (ر-ہ)

خونِ جگر ہونے تک، صاحبزادہ سید خورشید گیلانی، ناشر: خورشید گیلانی ٹرسٹ، ۲۲-ایچ، مرغزار کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۳۸۴۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

صاحب زادہ سید خورشید گیلانی مرحوم ایک ممتاز دانش ور، مذہبی مفکر، مصلح اور معروف کالم نگار تھے۔ انھوں نے فرقہ واریت سے بالاتر ہوکر عمر بھر ملی یک جہتی، عالم اسلام کے اتحاد اور ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ اُمت مسلمہ کا ایک فرد ہونا ان کے لیے باعث افتخار تھا خود ان کے بقول ''راقم ان لوگوں میں شامل ہے جسے کبھی کوئی گروہی سوچ مسحور نہ کرسکی''۔

زیرنظر کتاب سید مرحوم کے ان ۸۷ کالموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے عمرعزیز کے آخری چار ماہ (فروری تا مئی ۲۰۰۰ء) میں تحریر کیے۔ موضوعات میں تنوع ہے اور عصرِ حاضر کے عالمی اور ملکی مسائل پر ان کی جان دار آرا سامنے آئی ہیں۔ زیرنظر تحریروں میں انھوں نے ''پاکستانی سیاست کے شب و روز''، ''مسئلہ کشمیر''، ''اکیسویں صدی''،''نواز مشرف ڈیل''، ''نواز شریف کی متوقع واپسی'' اور ''قیادت کا قحط'' اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن موضوعی لحاظ سے غالب عنصر اُمت مسلمہ کے احوال کے بارے میں ہے۔ ''ایک ضرورت' ایک نعمت'' مرحوم کی آخری تحریر ہے۔

خورشید گیلانی نے اپنے منفرد اسلوب اور دل کش اندازِ تحریر کے ذریعے نہ صرف دلوں کو متاثر بلکہ مسخر کیا۔ جرأت اظہار ایک عطیہ خداوندی ہے جو انھیں وافر مقدار میں میسر تھا۔ خونِ جگر ہونے تک کی تحریریں اس لحاظ سے اہم اور منفرد ہیں کہ یہ بستر مرگ پر لکھی گئیں جب وہ کینسر جیسے موذی مرض کے سبب موت کے روبرو تھے۔

یہ تحریریں ملّت اسلامیہ کی فلاح و سربلندی کا شعور اور اتحاد بین المسلمین کے لیے ایک جذبہ وولولہ پیدا کرتی ہیں اور عالمی تناظر میں اُمت مسلمہ کو درپیش مسائل کے حل کے لیے اذہان کو نیا رُخ دینے میں مفید ہیں۔ (عبداللہ شاہ ہاشمی)

سو ہے' وہ بھی آدمی' عبداللطیف ابوشامل۔ ناشر: منشورات' منصورہ' لاہور-۵۴۵۷۰۔ صفحات: ۳۱۹۔ قیمت: کاغذی جلد (پیپر بیک) ۱۰۰ روپے' مجلد: ۱۲۵ روپے۔

کیا زندگی ایک المیہ ہے؟ نہیں' زندگی تو ایک نعمت ہے۔ مگر پاکستانی معاشرے میں خودکشیوں اور خودسوزیوں کے روز افزوں رجحان کے حوالے سے بلاشبہہ عام آدمی کے لیے زندگی ایک المیہ بن کر رہ گئی ہے۔ گلی کوچوں اور سڑکوں پر اور اخبارات کے صفحات پر بھی ہم ہر روز اُس کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن ہمارا مشاہدہ صرف اُس کے ظاہر اور سطح تک محدود رہتا ہے۔ ابوشامل نے زندگی کے المیوں کی تہ میں اُتر کر اُن کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا سماج اس قدر بدہیئت اور غیرمتوازن کیوں ہوگیا ہے؟ اس کا اندازہ ابوشامل کی بنائی ہوئی

لفظی تصویروں سے ہوتا ہے۔

مصنف نے ایک عرصے تک ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی میں زندگی کے عنوان سے معاشرے کے نچلے غریب' مفلس اور محروم طبقے کے کرداروں سے ملاقاتیں کیں' اُن کے انٹرویو لیے' اُن کے دلوں کے داغوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ اُن میں چوکیدار' اخبار فروش' نان بائی' گٹر صاف کرنے والے' اُونٹ والے' گدھا گاڑی والے' تالا چابی بنانے والے' گونگے' بہرے اور نابینا کردار شامل ہیں۔ ابوشامل اِن کرداروں کے ہم نوا' ہم درد اور غمگسار بن کر اُن کی دل کی باتوں کو سامنے لاتے ہیں' اُن کے دکھ درد' مصائب' پریشانیاں اور اُن کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ساتھ ہی اُن کے آنسو--- آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے کے حوالے سے ابوشامل نے حقیقی زندگی کو دریافت کیا ہے۔ معمولی اور چھوٹے آدمیوں کی گفتگو میں پتے کی باتیں بھی ہیں اور حکمت و بصیرت کی کرنیں بھی۔ یہ ایک ایسا سماجی اور عمرانیاتی مطالعہ ہے جو ہم جیسے کتابی لوگوں کے لیے معلومات انگیز اور چشم کشا ہے۔ دفتروں یا قہوہ خانوں اور ٹی ہاؤسوں میں بیٹھ کر لفظوں کے طوطے مینا بنانے والوں اور سگریٹ کے مرغولوں کے درمیان جدیدیت' مابعد جدیدیت اور وجودیت پر بحثیں چھانٹنے والوں کے لیے بھی ابوشامل کے پیش کردہ کرداروں میں غوروفکر اور بہت کچھ اخذ و اکتساب کا سامان موجود ہے۔

یہ کہانیاں نہایت خوب صورت اور دل کش اسلوب میں پیش کی گئی ہیں۔ اندازِ تحریر نپا تلا ہے جس میں فکر انگیزی اور دعوتِ غوروفکر ہے۔ جو لوگ ان کو کہانی یا افسانے کے طور پر پڑھیں گے وہ ان سے لطف اُٹھائیں گے اور اس کے ساتھ ایک ذہنی اور فکری غذا بھی حاصل کریں گے۔ (ر-ہ)

تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ناشر: اقبال اکادمی' ایوانِ اقبال' لاہور۔ ضخامت: ۵۵۶' مع اشاریہ و کتابیات (طبع دوم)۔ قیمت: مجلد ۲۵۰ روپے۔

عصرِ حاضر میں فکرِ انسانی کی تشکیل کے مبارک کام میں' جن چند نمایاں ترین شخصیات کا نام سامنے آتا ہے۔ اُن میں ایک رجلِ عظیم علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) ہیں۔ اگر مسلم

دنیا میں اسلامی فکر کی تعبیر وتشریح اور احیاے اسلام کے لیے کوشاں رہنے والے محسنوں کا تذکرہ کیا جائے تو اقبال کا نام نامی صفِ اول میں نظر آئے گا۔

اقبالیات میں علامہ کی تحریرات' مکتوبات' خطبات اور ملفوظات کی جمع و تدوین کی ضرورت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے متن کی صحت اور مختلف روایات کی جانچ پرکھ پر غیر معمولی طور پر زور دیا جاتا ہے۔

مصنف کا ڈاکٹریٹ کا یہ مقالہ اپنے موضوع پر ایک کامیاب کوشش ہے جسے انھوں نے بڑی لگن اور اہتمام سے انجام دیا۔ اقبال کی تصانیف کے ایک ایک لفظ کے مطالعے کے بعد' ممکن حد تک متن کے تقابلی جائزے پیش کیے گئے ہیں۔ صحت متن کی اس کاوش میں انھوں نے کس قدر محنت اور جاں کاہی سے کام لیا' اس کا اندازہ زیرتبصرہ کتاب پڑھ کر ہوسکتا ہے۔

علم وتحقیق کی دنیا میں یہ تصنیف ایک قابل قدر اور رہنما کتاب کی صورت میں سامنے آتی ہے' جس سے طالب علموں کو کارتحقیق میں آگے بڑھنے کی تربیت ملتی ہے اور حسنِ تحقیق اور معیارِ تحقیق کی شاہراہ دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔ موضوع کی مناسبت اور تحقیق کی مطابقت نے اسے ذخیرۂ اقبالیات میں گنتی کی چند بہترین اور زندہ کتب میں شامل کر دیا ہے۔ (سلیم منصور خالد)

میرا اقبال' (پانچ حصے)' تالیف: زبیر حسین شیخ' ادارت: سلمان آصف صدیقی۔ اہتمام: ایجوکیشنل ریسورس ڈویلپمنٹ سنٹر' اے ۳۵/۷' بلاک ایچ' شمالی ناظم آباد' کراچی۔ ناشر: سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ۔ صفحات: ۲۳' ۳۲' ۳۲' ۴۰' ۵۲۔ قیمت: ۲۵۰ روپے (مکمل سیٹ)۔

ربع صدی پہلے تک' بچوں کے لیے اقبال کے تعارف کا اولین اور بڑا ذریعہ ان کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' تھی مگر اب یہ وطن عزیز کے معدودے چند اسکولوں ہی میں پڑھی اور گائی جاتی ہے۔ ۲۰۰۲ء کو ''سال اقبال'' قرار دیا گیا لیکن جس انداز میں ہم نے یہ سال ''منایا''، بلکہ کہنا چاہیے کہ اسے ''گزارا'' وہ علامہ کے بقول: ''رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی'' کے مترادف تھا۔

اقبالیات پر کتابوں اور رسالوں کے انبار لگائے جاچکے ہیں لیکن اگر یہ سوال کیا جائے

کہ اقبال کو بچوں اور لڑکوں میں متعارف کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ تو شاید اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملے گا۔ ربع صدی پہلے اقبال اکادمی پاکستان نے' پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل سے سلسلہ درسیات اقبال لکھوایا تھا' جو اس وقت کے لحاظ سے ایک اچھی چیز تھی---لیکن میرا اقبال کے عنوان سے پانچ کتابوں کا ایک باتصویر اور رنگین خوب صورت سیٹ شائع ہوا ہے' اس نے اس باب میں اقبالیات کے ایک بڑے خلا کو نہایت احسن طریق سے پُر کر دیا ہے۔ اقبالیات میں اپنی نوعیت کا یہ ایک مثالی کام ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس کا اہتمام سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ نے کیا ہے (اقبالیات سے اپنائیت اور محبت کا دعویٰ تو پنجاب والوں کا زیادہ ہے---!)

بچوں اور طلبہ کے لیے اقبال کی منتخب نظموں' غزلوں اور رباعیات کے ساتھ ان کا تعارف' پس منظر' فرہنگ' ہر نظم سے متعلق سوالات اور نظم پر کچھ تبصرہ---کہیں کہیں چوکھٹے میں ''کیا آپ جانتے ہیں؟'' عنوان کے تحت علامہ کی زندگی کا کوئی دلچسپ اور سبق آموز واقعہ درج ہے۔

میرا اقبال کی غرض و غایت چوتھی جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے بچوں میں ''اردو شاعری کا ذوق'' پیدا کرنا اور انھیں ''اقبال کے افکار سے روشناس'' کرانا ہے۔ منظومات کے جمالیاتی پہلو (قدرتی مناظر' پرندے' جانور) تصویروں کے ذریعے نمایاں کیے گئے ہیں۔ آخری دو دو صفحوں کو ''بیاض'' کا عنوان دے کر طلبہ کو اپنے پسندیدہ اشعار لکھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ کچھ شبہہ نہیں کہ مرتبین نے یہ کام مہارت سے انجام دیا ہے۔ نظرثانی کرنے والی مجلس میں پہلا نام پروفیسر عنایت علی خاں کا ہے۔

بچوں' نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے یہ ایک خوب صورت اقبالیاتی تحفہ ہے۔ ماہرین اقبالیات اور اقبالیاتی اداروں پر ایک قرض تھا جسے چکانے اور بہ حسن و خوبی چکانے کا کام ایک غیر اقبالیاتی ادارے نے انجام دیا ہے۔ ضروری ہے کہ سندھ کے ہی نہیں' ملک کے تمام اسکولوں میں خصوصاً نظریاتی نجی اسکولوں میں اسے شامل نصاب کیا جائے۔ (ر-ہ)

مدیر کے نام

محمد اسلام خان ' لاہور

جنوری ۲۰۰۳ء کا ترجمان القرآن ادارے کی جدت پسندی کا مظہر بن کر موصول ہوا۔ پہلا تاثر تو یہ ہے کہ دل ترجمان کا یہ حلیہ قبول کر رہا ہے نہ نگاہیں' ممکن ہے یہ تاثر آخری نہ ہو اور اجنبیت مانوسیت میں بدل جائے۔

ترجمان القرآن کو بالخصوص پاکستان جو جماعت اسلامی کا اولین میدان عمل ہے' کے عوام کو نفسیاتی' معاشرتی اور معاشی عنوانات سے جو متنوع مسائل درپیش ہیں ان پر ٹھوس تحقیق کر کے جواب فراہم کرنا چاہیے۔ پاکستانیت' ترجمان القرآن میں کم کیوں ہے؟ معیشت و معاشرت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے مسلمانوں کو انفرادی سطح پر کیا کرنا چاہیے اور تہذیب و تمدن کے اسلامی تہذیب و تمدن بننے کے درمیان کون کون سے مرحلے دکھائی دے سکتے ہیں ان کا ذکر ترجمان کے صفحات میں بہت کم ہے۔

''رسائل و مسائل'' میں سوال پیش ہوتا ہے' جواب دیا جاتا ہے لیکن سوال پھر اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ 'شادی سے قبل ملاقاتیں' (جنوری ۲۰۰۳ء) کے عنوان سے شائع ہونے والا سوال اس کی ایک مثال ہے۔

اسلامی تحریکوں کا تعارف ترجمان میں شائع ہوتا ہے لیکن ان تحریکات اسلامی پر تنقید کی جرأت دکھائی نہیں دیتی۔ ان تحریکات کے تجربات سے سیکھنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مختلف النوع تحریکات سے تعمیری بحث مباحثہ کو فروغ ملے۔ ماریا ہولٹ کے مضمون کا جو ترجمہ جنوری کے شمارے میں شائع ہوا ہے زیادہ معلومات افزا نہیں۔

مولانا محمد سلطانؔ ' لاہور

بانی ترجمان القرآن کی روح کو شاید موجودہ چھوٹے قد کے ترجمان کو دیکھ کر حیرت ہوئی ہوگی۔

ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم ' فیصل آباد

ترجمان کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ نئے سائز کو دل نے قبول نہیں کیا۔

سید وقاص انجم ' لاہور

ترجمان القرآن نے مسلسل محنت کر کے جو نام کمایا ہے اس پر اللہ کا شکر بجالانا اور ترجمان کی ٹیم کی محنت کو سراہا نہ جانا زیادتی ہوگی۔ پروفیسر خورشید صاحب جس عرق ریزی اور دل سوزی سے اشارات قلم بند کر رہے ہیں وہ زورِ قلم نہیں بلکہ خونِ جگر سے عبارت ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے۔ آمین!

ترجمان کے سائز کو کم کرنا (حجم بڑھانے کے باوجود) میری نظر میں درست نہیں۔ ترجمان کا سمٹنا کچھ جچ نہیں رہا۔

مضامین کے انتخاب' عنوانات کے تنوع اور مسائل پر گرفت کے حوالے سے ترجمان اب الحمدللہ ایک ایسا رسالہ بن گیا ہے کہ جس کے نہ ملنے سے تشنگی کا احساس رہتا ہے۔

اظہراقبال حسن ' لاہور

مجھے ترجمان القرآن سے دلی لگاؤ ہے اور مرحوم و مغفور استاذ خرم مرادؒ سے کیے گئے وعدے کے مطابق ترجمان کی اشاعت میں اضافے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔ جنوری ۲۰۰۳ء کے شمارے کا چھوٹا سائز بہت اچھا اور بھلا لگا۔ ترجمان کی انتظامیہ نے قارئین پر احسان کیا ہے کہ صفحے کا سائز کم مگر صفحات کی تعداد بڑھا کر مطالعے کے مواد میں اضافہ کر دیا ہے' جب کہ قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ یہ سائز اس لحاظ سے بھی بہت مناسب لگا کہ ہاتھ میں آسانی سے آتا ہے اور کتاب نما محسوس ہوتا ہے' مجھے امید ہے کہ قارئین اس تبدیلی کو پسند کریں گے۔

اس بار ''اشارات'' کے ساتھ ''شذرات'' کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ بھی مفید سلسلہ ہے۔ اس طرح کئی اہم مسائل زیربحث آسکیں گے اور تنوع بھی بڑھے گا۔ اللہ تعالیٰ ترجمان کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے تاکہ یہ تشنگان فکروعمل کی پیاس بجھاتا رہے۔

راشد نسیم ' کراچی

کئی ساتھی ایسے ملے جنھیں نئے سائز کا ترجمان پسند نہ آیا۔ مجھے تو بہت پسند آیا' بلکہ اچھا لگا۔ شاید ہم لوگ طرزِ کہن پر اڑنا نہیں چھوڑ سکتے۔

محمد حیات اعوان ' خوشاب

جنوری ۲۰۰۳ء کا پورا شمارہ ہی بہت موثر ہے۔ البتہ ''موڈریٹ اسلام کی تلاش'' مولانا مودودیؒ کی اپنی تربیت کے لیے ہدایات' خرم مرادؒ کا خطبہ ''دل کی زندگی'' اور ''ڈیپریشن کا قرآنی علاج'' خاصے کی چیز ہیں۔

صابر نظامی 'قصور

''موڈریٹ اسلام کی تلاش'' (جنوری ۲۰۰۳ء) میں پروفیسر خورشید احمد نے مغرب کی سازش کو بے نقاب کر دیا ہے۔ مغرب اسلام کو نظامِ حکمرانی سے دُور رکھنا چاہتا ہے اور ایک دور رس حکمت عملی سے اسلام کو مٹانے پر عمل پیرا ہے۔ پروفیسر صاحب کا تجزیہ بروقت رہنمائی ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی 'جدہ

یوں تو یادِ رفتگاں میں آپ جو کچھ بھی لکھتے ہیں پڑھنے کے لائق ہوتا ہے مگر ڈاکٹر محمد حمیدؒ اللہ کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ خاص چیز ہے۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ 'لاہور

پروفیسر خورشید صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی ۴۰ سالہ خط و کتابت کا تذکرہ کیا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر حمیدؒ اللہ سے سیکڑوں لوگوں کی خط و کتابت رہی۔ ان خطوط کو شائع کرنے کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔ یہ بھی ان کی سیرت کا اہم پہلو ہے جو ابھی تک مخفی ہے۔ ان کی دیگر خدمات کا بھی تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ علم و تحقیق میں جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا' کاش ہم اُسے برقرار رکھ سکیں!

سعید الرشید عباسی 'مری

''یادِ رفتگاں'' (جنوری ۲۰۰۳ء) میں پروفیسر خورشید احمد نے ڈاکٹر حمیدؒ اللہ کی زندگی کا ایک انتہائی سبق آموز واقعہ بیان کیا کہ زندگی بھر میں ڈاکٹر حمیدؒ اللہ صرف ایک مرتبہ کلاس میں تاخیر سے پہنچے اور تاخیر کا سبب اپنی والدہ محترمہ کی وفات بتایا۔ حقیقتاً تاریخ عالم کے روشن اُفق پر اُبھرنے والے ستارے اسی کردار اور پابندی کے حامل نظر آتے ہیں۔

عبدالواسع کاکڑ ' پشین' بلوچستان

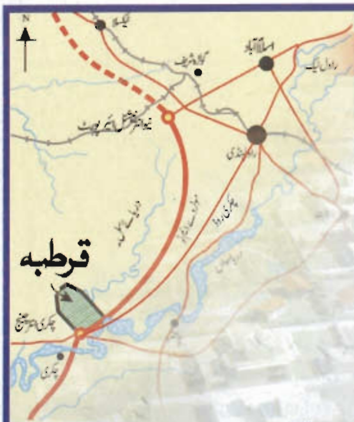
صدق' لکھنؤ ۱۹۵۵ء سے اخذ شدہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا مضمون ''رمضان کے بعد'' فکر کو جلا بخشنے اور عمل پر اُبھارنے والا ہے۔ اسلاف جو اس صدی میں گزرے ہیں یا ماقبل' برعظیم پاک و ہند کے ہوں یا عالم عرب کے--- ایمان کو روشن کرنے والی تحریروں کے انتخاب کا یہ سلسلہ مفید ہے۔

''غیر مسلموں کے قانونی و مدنی حقوق'' میں حامد عبدالرحمٰن الکاف کے دلائل وزنی ہیں۔ اس صدی کی زندہ تحریکوں کے اکابر نے بھی تحقیق و اجتہاد کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ، سید قطب شہیدؒ، نمایاں ہیں۔ اب' جب کہ ''حزبیت'' سے نکل کر ہم ''اجتماعیت'' کی طرف جانے لگے ہیں' تمام مکاتب فکر کے اکابر کو اجتماعی اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرنا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ○ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک بری موت سے بچاتا ہے
○ چھپا کر دیا جانے والا صدقہ رب کی آتش غضب بجھاتا ہے ○ اور صلہ رحمی سے عمر میں برکت
ہوتی ہے۔ (ترغیب بحوالہ طبرانی)

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

K-Set-S-19-12-02-SHABTAZ



امن ومحبت اور دین ودانش کی بستی

موٹروے اسلام آباد

قرطبہ

تعارف:

مدینۃ العلم ایک مثالی اسلامی بستی بسانے کا منصوبہ پیش کر رہی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد مدینۃ العلم کے صدر، سید منور حسن مدینۃ العلم کے جنرل سیکرٹری اور ممتاز ذمہ دار افراد گورننگ باڈی کے ارکان ہیں۔

محل وقوع:

زیرو پوائنٹ اسلام آباد سے تقریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو (50 کلومیٹر) پر موٹروے چکری انٹرچینج پر خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں کھلے اور پُر فضا ماحول میں واقع ہے۔ قرطبہ کے گردونواح میں بستیاں موجود ہیں۔ جو شہری کثافتوں سے پاک لیکن بیشتر شہری سہولتوں سے آراستہ ہیں۔

موجودہ سہولیات:

★ مقامی ٹرانسپورٹ ★ مقامی سکول بوائز اینڈ گرلز ★ داران (Varan) بس سروس
★ چکری سروس ایریا میں شاپنگ سنٹرز ★ پٹرول پمپ ہسپتال، بنک، ڈاکخانہ، سٹیلائیٹ ٹیلی فون ★ پولیس سٹیشن وغیرہ۔

خصوصی سہولیات

★ کشادہ سڑکوں کا نظام ★ کھیل کے میدان ★ مساجد ★ کمیونٹی سنٹرز
★ ابتدائی تعلیمی سہولیات سے یونیورسٹی سطح تک کے تعلیمی ادارے ★ صحت عامہ
★ سیکورٹی انتظامات ★ قبرستان

امتیازی خصوصیات:

• دین وشریعت، • فقہ وقانون • تعلیم وتحقیق • صنعت وتجارت
• انفرمیشن ٹیکنالوجی اور جدید علوم وفنون کے مثالی مراکز کا قیام

قیمت پلاٹ:

20,000 کنال پر مشتمل عظیم الشان منصوبہ میں ترقیاتی اخراجات سمیت یکمشت ادائیگی / قسطوں پر پلاٹ حاصل کیجئے۔ خواہشمند حضرات کے اصرار پر سابقہ اور نئے خریداروں کی سہولت کیلئے ادائیگی اقساط کی مدت تین سال کر دی گئی ہے۔ پلاٹ کی قیمت میں کسی اضافے کے بغیر اقساط میں 33.3% کمی کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔

بمعہ ترقیاتی اخراجات

پلاٹ سائز	قیمت پلاٹ	20% ادائیگی بکنگ	گیارہ سہ ماہی اقساط میں	آخری قسط
500 گز	500,000 روپے	100,000 روپے	33,400 روپے	32,600 روپے
250 گز	250,000 روپے	50,000 روپے	16,700 روپے	16,300 روپے
125 گز	125,000 روپے	25,000 روپے	8,350 روپے	8,150 روپے

یکمشت ادائیگی کی صورت میں قیمت پر 10 فیصد خصوصی رعایت دی جائے گی۔

طریقہ کار:

درخواست فارم کے ہمراہ شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اور تین پاسپورٹ سائز تصاویر لگائیں اور چیک / ڈرافٹ کے ساتھ ہمارے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

- ادائیگی کے لئے چیک ڈرافٹ بنام مدینۃ العلم سوسائٹی، پاکستان میں بنک الفلاح لمیٹڈ کی تمام برانچوں (اکاؤنٹ **01122443** برائے پاکستانی روپے) میں سہولت موجود ہے۔
- برائے پاکستانی روپے (Pak Rs.) اکاؤنٹ نمبر: 01122443
- برائے ڈالر (U.S. $) اکاؤنٹ نمبر: 01800375

درخواست فارم بمعہ معلومات بروشر درج ذیل دفاتر کے علاوہ جماعت اسلامی کے دفاتر سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے

مدینۃ العلم

لاہور (ہیڈ آفس)

منصورہ ملتان روڈ لاہور پاکستان

فون: 5-5432391 /4-5419520 فیکس: 5432194 (92-42)

E-mail: amir@ji.org.pk URL: http://www.jamaat.org

اسلام آباد (پروجیکٹ آفس)

میجر (ر) ابرار اعوان (پروجیکٹ ڈائریکٹر)

فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ، فضل حق روڈ بلیو ایریا اسلام آباد

فون نمبر 051-2206380-2274563

فیکس 051-2270411

موبائل 0300-9501354

L.R.L. 99 Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE. Phone: 7587916 Fax: 7585590